

فتیان  
کا مطلوب انسان

مولانا وحید الدین خاں

مطبوعات اسلامی مرکز

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ  
قُلْ اطِيعُوا اللّٰهَ  
وَاطِيعُوا الرَّسُوْلَ

مجلس التحقیق الاسلامی اربنہ

معدت البریری

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

## معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

### تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے  
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی  
کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے  
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

✉ [KitaboSunnat@gmail.com](mailto:KitaboSunnat@gmail.com)

🌐 [www.KitaboSunnat.com](http://www.KitaboSunnat.com)

# قرآن کا مطلوب انسان

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

ISBN 91-85063-48-6

مطبوعات اسلامی مرکز

جملہ حقوق محفوظ

ناشر: مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نیٹ ڈہلی ۱۱۰۰۱۳

اشاعت اول ۱۹۷۹

اشاعت دوم ۱۹۸۲

اشاعت سوم ۱۹۸۶

مطبوعہ: جیت پریس، ڈہلی ۶

MAKTABA AL - RISALA  
1439 OCEAN AVE. # 4C  
BROOKLYN, N.Y. 11230  
TEL: (718) 258-3435

# فہرست

۲	صفحہ	آغاز
۳		اسلام ایک عظیم جدوجہد
۱۹		قرآن کا مطلوب انسان
۳۰		مومن کی تصویر
۴۱		بامقصد زندگی
۴۸		یہ بے حس کیوں
۶۰		دعوت اسلامی کے کارکنوں کی ذمہ داریاں
۶۳		کوئی سننے والا ہے جو سنے
۷۰		خدمت دین کی مشکلات
۷۶		ہمیں کیا کرنا ہے

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

زیر نظر مجموعہ راقم الحروف کی چند تقریروں پر مشتمل ہے۔ یہ تقریریں جماعت اسلامی ہند کے مختلف اجتماعات میں ۱۹۵۵ سے لے کر ۱۹۶۳ تک پیش کی گئی تھیں اور اس کے بعد اسی زمانہ میں اکثر ماہنامہ زندگی (رام پور) اور بعض ماہنامہ الفرقان (کھنوی) میں شائع ہوئیں۔ ان رسائل کے صفحات سے لے کر انھیں کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔ ان مختلف تقریروں کو جو چیز ایک کتاب کا مشترک حصہ بناتی ہے، وہ ان کا مشترک موضوع ہے۔ یہ ہے: اسلام کی حقیقت کو واضح کرنا، اور اس کی خدمت و اشاعت کا جذبہ دلوں میں ابھارنا۔

آدمی فطرت سے کچھ صلاحیتیں لے کر آتا ہے۔ مثلاً کوئی فیاض ہوتا ہے کوئی شیریں بیان۔ کوئی فعال ہوتا ہے کوئی حوصلہ مند۔ یہ "انسان" وہ ہے جو ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ گرا اللہ تعالیٰ کے یہاں جس انسان کی قیمت ہے وہ یہ نہیں ہے۔ اللہ کے یہاں قیمت رکھنے والا "انسان" وہ ہے جو آدمی کے خود اپنے ارادہ سے ابھرتا ہے۔ آدمی اپنے شعوری عمل، بالفاظ دیگر خدائی محرک کے تحت اپنے کو جیسا بناتا ہے اسی کے مطابق وہ اللہ کے یہاں درجہ حاصل کرتا ہے۔

انسان بظاہر بہت سے اعضاء و دجوارح اور بے شمار بالوں اور ناختوں کا مجموعہ ہے۔ مگر حقیقتاً انسان ایک لطیف وحدت کا نام ہے۔ اس وحدت کی سطح پر جب کسی فکر کا غلبہ ہو جاتا ہے تو وہ اس کے وجود کے تمام حصوں میں نظر آہر ہوتی چلی جاتی ہے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ دین کا بھی ہے۔ دین، اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے، کسی مجموعہ قوانین کا نام نہیں، وہ ایک قلبی حالت کا نام ہے۔ قلب انسانی میں جب یہ حالت پیدا ہو جاتی ہے تو پوری زندگی اس کے رنگ میں رنگی چلی جاتی ہے۔ خواہ "نماز روزہ" کا معاملہ ہو یا اسلامی دعوت کا، راہ سے کا نشانہ ہانے کا عمل ہو یا میدان جنگ میں جہاد کرنے کا، سب کا اصل مقصد یہ ہے کہ آدمی کے اندر وہ مومنانہ روح پیدا ہو جو آدمی کو اللہ سے قریب کرتی ہے اور اس کے اندر وہ اعلیٰ خصوصیات پیدا کرتی ہے جو اس کو صفتی دنیا کا شہری بنانے والی ہیں۔ یہی اندر کا "مومن" وجود میں آنا تمام اعمال کا اصل مقصود ہے۔ زیر نظر مجموعہ کے مضامین میں، مختلف انداز سے، یہی حقیقت ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ چون کہ یہ سب اجتماعی خطابات ہیں، اس لئے قدرتی طور پر ان کا انداز تقریری ہے نہ کہ تصنیفی۔

کتابی صورت میں شائع کرتے ہوئے راقم الحروف نے ان مضامین پر نظر ثانی کی ہے۔ تاہم یہ نظر ثانی صرف جزوی یا فضلی تبدیلیوں کی حد تک ہے۔ اصل مضمون میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کی گئی ہے۔ یہ کہنا صحیح ہو گا کہ یہ مضامین تقریباً اپنی اصل ابتدائی صورت ہی میں شائع کئے جا رہے ہیں۔ ایسا زیادہ تر اس جذبہ کے تحت کیا گیا ہے کہ ان کی تاریخی حیثیت برقرار رہے۔

دعید الدین ۲۰ اپریل ۱۹۷۹

## اسلام - ایک عظیم جدوجہد

قرآن مالک کائنات کافران ہے، جو اس بات کا فیصلہ کرتا ہے کہ عزت کس کے لیے ہے اور ذلت کس کے لیے۔ کامیاب کون ہے اور نامراد کون۔ ذنیوی اعتبار سے جب ہم کامیابی کا لفظ بولتے ہیں تو اس کے معنی ہوتے ہیں کسی سوسائٹی میں ایک شہری کو ترقی کے جو مواقع دیے گئے ہیں ان کو استعمال کر کے اونچے درجات تک پہنچنا۔ ایک شخص بڑا تاجر اور نچا عہدیدار اور اعلیٰ اعزازات کا مالک ہو تو اس کو کامیاب انسان کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ماحول کے اندر تجارت کو بڑھانے کی جو ممکن صورتیں ہیں، اعلیٰ عہدوں پر پہنچنے کے لیے جو صعفیات مقرر کی گئی ہیں، اعزازات کے حصول کے لیے جو راستے بنے ہوئے ہیں، وہ شخص ان کو عبور کر گیا ہے اور اپنی جدوجہد کے نتیجے میں اس نے اس بلند مقام کو پایا ہے جو قانون و وقت کے تحت اس کے لیے ممکن تھا۔ کامیابی کے معنی الدین کا جرائع پالینے کے نہیں ہیں، بلکہ کامیابی اس واقعہ کا نام ہے کہ ایک شخص نے اپنی صلاحیت اور کام کے مواقع کو ان راہوں میں صرف کیا جو اس کے لیے کھلی ہوئی تھیں اور بالاتر اپنی کوششوں کے نتیجے میں اس منزل تک پہنچ گیا جہاں ان راستوں کا کوئی چلنے والا پہنچتا ہے۔ کامیابی کوئی خوش قسمتی سے پیش آنے والا اتفاقی حادثہ نہیں ہے بلکہ وہ صبح جدوجہد کا فطری نتیجہ ہے۔ اسی بات کو ایک مفکر نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے:-

”لائق شخص اور کامیاب نہ ہو، یہ جھوٹ ہے“

یہی حال دوسری زندگی کی کامیابی کا بھی ہے جو انسان کی حقیقی منزل ہے جہاں تمام اگلے پھیلے انسان اپنے رب کے حضور جمع کیے جائیں گے۔ اس دن عزت اور کامیابی ان لوگوں کے لیے ہوگی جو خدا کی رضا کو پائیں اور ذلت اور نامرادی ان کے لیے جو اس کی رضا کو حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔ پہلے گروہ کے لیے دائمی عیش ہے اور دوسرے گروہ کے لیے دائمی عذاب۔ جو شخص قرآن پر ایمان لائے اور اسلام کو اختیار کرے وہ گویا پہلے انجام کا امیدوار ہے اور دوسرے انجام سے بچنا چاہتا ہے۔ مگر اس مقام بلند کا حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ ایک عظیم چڑھائی ہے جس کو عبور کرنے کے لیے عمل کے بعد آدمی اس کے اوپر پہنچتا ہے۔ خدا کا انجام کسی شہری ہوئی چیز کی طرح محض اتفاق سے کسی کو نہیں مل جاتا، بلکہ ذنیوی کامیابی کی طرح وہ ایک زبردست جدوجہد کا قدرتی نتیجہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق کسی شخص کو حاصل ہوتا ہے۔ آخرت میں انسان کی کامیابی دراصل ایک لمبے امتحان سے پار تر جانے کا دوسرا نام ہے۔ انسان کو پیدا کر کے اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی دنیا میں ڈال دیا ہے جہاں طرح طرح کے باطل نظریات اور فاسد رجحانات ہیں جن سے اسے اپنے دل و دماغ کو پاک کرنا ہے۔ بہت سے غلط اور ناجائز طریقے ہیں جن سے اسے بچنا ہے۔ بہت سی شیطانی اور طاغوتی قوتیں ہیں جو انسان کو راہ حق سے پھیرنے میں لگی ہوئی ہیں۔ ان طاغوتوں سے

لڑتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ غرض دشواریوں سے بچھا ہوا ایک راستہ ہے جس کو طے کر کے اس کو اپنے رب تک پہنچنا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔  
 نَجَّيْتُ النَّاسَ مِنَ النَّارِ وَالشَّهْوَاتِ وَتَجَبَّبْتُ  
 الْجَنَّمَ لَذُلُوقِهَا وَتَجَبَّبْتُ الْجَنَّمَ لَذُلُوقِهَا وَتَجَبَّبْتُ الْجَنَّمَ لَذُلُوقِهَا  
 الْحَيَّةُ بِالْمَكَارِبِ (متفق علیہ) سے ڈھکی ہوئی ہے۔

اسلام کی حقیقت کو اگر ایک لفظ میں بیان کرنا ہو تو اس کے لیے "قربانی" سے زیادہ موزوں اور کوئی لفظ نہیں ہو سکتا۔ اسلام دراصل ایک زبردست جدوجہد ہے وہ قربانی کا ایک مسلسل عمل ہے جو ایمان لانے کے بعد سے آدمی کی موت تک جاری رہتا ہے۔ سب سے پہلی قربانی آدمی اس وقت دیتا ہے جب وہ اپنے پسندیدہ خیالات اور قلبی رجحانات کو خیر باد کہہ کر دین حق کو قبول کرتا ہے، اس کے بعد دوسری قربانی وہ ہے جو عمل کی دنیا میں دی جاتی ہے۔ اخلاق و معاملات اور معیشت و تمدن میں وہ ان طریقوں کو چھوڑ دیتا ہے جو خدا کو ناپسند ہیں اور ان طریقوں کو اختیار کر لیتا ہے جو خدا کو محبوب ہیں۔ پھر جب وہ ان دونوں مرحلوں کو پا کر لیتا ہے تو وہ امتحان کے اس آخری میدان میں پہنچ جاتا ہے جہاں نہ صرف حرام چیزیں بلکہ زندگی کے جائز اٹاشے بھی چھوڑ دینے پڑتے ہیں۔ حتیٰ کہ اپنی جان بھی قربان کر دینی پڑتی ہے۔ یہ جان کی قربانی اس سلسلہ امتحان کی تکمیل ہے اور عہد بندگی کو آخری طور پر ثابِت کر دکھانا ہے جو ایمان لا کر آدمی نے اپنے رب سے کیا تھا۔ یہ تین دور جن سے گزر کر آدمی اپنے رب تک پہنچتا ہے اور اس کی رضا کا مستحق بنتا ہے، ان کو قرآن میں ایمان، ہجرت اور جہاد کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فرمایا:۔

الَّذِينَ آمَنُوا وَهَابُوا وَجَاهِدُوا لِحَقِّهِمْ  
 مَبِئَلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ أَكْبَرًا  
 ذَٰلِكُمْ عِنْدَ اللَّهِ ذُرِّيَّةٌ مُمْتَلِكَةٌ هَمَّتْ  
 الْفَائِزُونَ (توبہ - ۲۰)

جو لوگ ایمان لائے، جنہوں نے ہجرت کی اور اپنی جانوں اور مالوں سے خدا کی راہ میں جہاد کیا ان کے لیے خدا کے یہاں بڑا درجہ ہے اور وہی لوگ دراصل کامیاب ہونے والے ہیں۔

اس آیت میں ایمان سے مراد ان حقائق کو تسلیم کرنا ہے جو قرآن میں متعین کیے گئے ہیں، اور ہجرت سے مراد اس اعتراف اور اس کے تقاضوں کے خلاف جو کچھ ہے اس کو چھوڑ دینا اور جہاد اس کو نبط اور جدوجہد کا نام ہے جو ایمان اور ہجرت کی زندگی کو آخری حد تک باقی رکھنے کے لیے اس دنیا میں آدمی کرتا ہے۔ اس طرح یہ ایمان، ہجرت اور جہاد۔ ایک دوسرے سے الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی سلسلہ سفر کی اگلی پچھلی منزلیں ہیں۔ یہ ایک ہی کیفیت کے مختلف ارتقائی مراحل ہیں جن کو مہینہ کرنے کے لیے جدا جدا عنوان دے دیا گیا ہے۔ نیز ہجرت اور جہاد کی کوئی متعین صورتیں نہیں ہیں۔ ایمان کی حقیقت، مختلف حالات میں، مختلف صورتوں میں ظہور کرتی ہے۔ کسی کے لیے ہجرت ترک وطن کے ہم سہی ہوتی ہے، کسی کے لیے صرف یہ کہ وہ اپنے اہل گھر کے برے رجحانات کو چھوڑ دے۔ کسی کا جہاد اس کو بیرونی قوتوں سے ٹکراؤ کا سامنا کرنا

ہے کسی کا جہاد صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی داخلی ترغیبات کا مقابلہ کر کے اس کو زیر کرے۔

### ایمان

سب سے پہلے ایمان کو لکھیے یہ اس عظیم اسماعی مہم میں شریک ہونے کا فیصلہ کرنا ہے جس کی ابتدا زبان کے اقرار سے ہوتی ہے اور جس کی انتہا یہ ہے کہ اسی پر قائم رہتے ہوئے آدمی اپنی جان دے لے۔ یہ وہ عہد ہے جو بندہ اپنے خدا سے اس بات کے لیے کرتا ہے کہ وہ ساری عمر اس کا وفادار رہے گا۔ ایمان اس کیفیت کا نام ہے جو حقیقت کے صحیح اور مخلصانہ شعور سے پیدا ہوتی ہے۔ جب آدمی اس حیرت انگیز کائنات کے پیچھے ایک لامحدود قوت کا شاہدہ کرتا ہے جب وہ خدا کے رسول کو تسلیم کر کے اس کے تمام فیصلوں پر راضی ہو جاتا ہے، جب اس کا دل اچکا راتھا ہے کہ تخلیق کا بیخیم منصوبہ بے مقصد نہیں ہے بلکہ ایک ایسا دن آنے والا ہے جب ماضی اور مستقبل کے تمام انسانوں کو جمع کر کے ان کا حساب لیا جائے، تو اسی کیفیت کے مجرہ کو ہم ایمان سے تعبیر کرتے ہیں۔

ایمان کی اصل روح اعتماد کرنا ہے۔ یہ اعتماد ایک ایسی سستی کے بارے میں ہوتا ہے جس کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتے۔ اس لیے اس میں یقین کا مفہوم پیدا ہوا۔ اسی طرح خدا کو اس کی تمام صفات کے ساتھ ماننے کے لازم معنی یہ ہیں کہ اس کے غضب سے ڈرا جائے اور اس کے عذاب سے بچنے کی فکر کی جائے اس لیے اس کے ساتھ تقویٰ اور خوف کا جزا ضروری ہے۔ اس طرح اگر قرآن کے تصور ایمان کی تشریح کے لیے تین الفاظ - یقین، اعتماد اور خوف - کو اکٹھا کر دیں تو ہم اس کی روح کے بالکل قریب پہنچ جاتے ہیں۔ ایمان اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے خدا اور اس کے رسول پر اس نئی اعتماد کا نام ہے جو یقین کامل سے پیدا ہوتا ہے اور خدا سے اس خوف کا نام ہے جو آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ کسی پلڑی میں اور خوف کے تسلط کے بغیر خود سے اس کی اطاعت کو اپنے اوپر لازم کر لے۔

یقین جو ایمان کا پہلا جزو ہے، یہ خارج سے درآمد کی ہوئی کسی چیز کا نام نہیں ہے بلکہ اس حقیقت کا زندہ شعور ہے جو خود انسان کی فطرت میں چھپی ہوئی ہے۔ انسان کائنات پر عزیز کرتا ہے۔ رسول کی نیلوت کو دیکھتا ہے اور اپنے اندر سے اٹھنے والی آواز پر کان لگاتا ہے تو یہ تینوں چیزیں بالکل ایک معلوم ہوتی ہیں۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کوئی ایک ہی پیغام ہے جو ایک وقت میں تین مختلف مقامات سے سنا ہو رہا ہے۔ خدا کا رسول جس حقیقت کی خبر دیتا ہے، کائنات پوری کی پوری بالکل اس کی ہم آہنگ معلوم ہوتی ہے اور انسان کی اندرونی آواز بہترن اس کی تصدیق کرتی ہے۔ وہ کتاب الہی میں جو کچھ پڑھتا ہے زمین و آسمان کے اندر اسی کو دیکھتا ہے اور جو کچھ پڑھتا ہے اور دیکھتا ہے اس کی فطرت اس کو اس طرح قبول کر لیتی ہے جیسے کسی خانے میں بالکل اسی ساز کی چیز رکھ دی گئی ہو۔ محکم یقین کی یہ کیفیت کسی کو خود بخود حاصل نہیں ہوتی۔ جس طرح فطرت کی ہر صلاحیت اسی وقت رد و بکار آتی ہے جب اس کو نشوونما دے کر

بھارا جائے، کائنات نامہراز اسی وقت انسان کے اوپر بے نقاب ہوتا ہے جب اس کی تلاش میں وہ اپنے آپ کو کم کر چکا ہو۔ اور کسی کتاب کے مضامین اسی وقت آدمی پر کھلتے ہیں اور اسے فائدہ پہنچاتے ہیں جب اس کا گہرا مطالعہ کر کے اس کے مطالب کو اخذ کیا جائے۔ ٹھیک اسی طرح یہ یقین بھی آدمی کو اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ اپنی قوت ارادی کو اس کے لیے کام میں لائے۔ یہ اگرچہ کائنات کی دہن ترین حقیقت ہے مگر اس دنیا کے لیے اللہ تعالیٰ کا قانون یہی ہے کہ آدمی کو وہی کچھ ملے جس کے لیے اس نے جدوجہد کی ہو۔

ایمان کا دوسرا جزو اعتقاد ہے۔ اپنی ذات اور کائنات کا مطالعہ جہاں آدمی کو ایک طرف یہ بتاتا ہے کہ ایک عظیم خالق اور کار ساز ہے جو اس کا رضائے کے تمام واقعات کا حقیقی سبب ہے۔ اسی کے ساتھ اور عین اسی وقت اس کو دوا اور باتوں کا شدید احساس ہوتا ہے۔ ایک اپنی انتہائی بے چارگی کا اور دوسرے خدا کے بے پایاں احسانات کا۔ وہ دیکھتا ہے کہ وہ اپنے وجود کے لیے بے شمار چیزوں کا ضرور گزرا ہے۔ مگر وہ کسی ایک چیز کو بھی خود سے نہیں بنا سکتا۔ وہ ایک کمزور بچہ کی شکل میں پیدا ہوتا ہے اور بڑھاپے کی ناتوانیوں کے ساتھ ختم ہوجاتا ہے۔ وہ ایک ایسی زمین کے اوپر کھڑا ہے جو فضا کے اندر معلق ہے جس کے توازن میں معمول بگاڑ بھی آجائے تو اس کو تباہ کر دینے کے لیے کافی ہے وہ اپنے کو ایک ایسی عظیم کائنات کے اندر گھرا ہوا پاتا ہے جس پر اسے کوئی اختیار نہیں۔ ان حالات میں اس کو اپنا وجود بالکل بے بس اور حقیر معلوم ہونے لگتا ہے۔ دوسری طرف وہ دیکھتا ہے کہ وہ سب کچھ جس کی اسے ضرورت تھی، اس کے لیے مہیا کر دیا گیا ہے۔ اس کو ایسا جم دیا گیا ہے جو دیکھتا ہے، جو سنتا ہے، جو بولتا ہے، جو سوچتا ہے اور اس کی قوتوں کو برقرار رکھنے کے لیے ایک خود بخود چلنے والی مشین کی طرح مسلسل کام کر رہا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ زمین و آسمان کی ساری قوتیں پوری ہم آہنگی کے ساتھ اس کی خدمت میں لگی ہوئی ہیں۔ اس کو اپنا وجود مجسم احسان نظر آنے لگتا ہے۔ اس کے اندر بے پناہ جذبہ شکر اٹھتا ہے اور وہ احسان مندی کے جذبہ سے لبریز ہوجاتا ہے۔ یہ واقعہ اس کو مجبور کرتا ہے کہ اس جہتی کو اپنا سب کچھ قرار دے جس نے یہ سارا انتظام اس کے لیے کیا ہے پہلی چیز اس کو اپنی مکمل بے بسی کا یقین دلاتی ہے اس کو شدید احساس ہوتا ہے کہ کوئی بلند تر قوت ہو جو اس کی دستگیری کرے اور دوسرا احساس اس کی اس طلب کا جواب بن کر سامنے آتا ہے۔ جو مطالعہ اس کو اپنے اندر خلاء کا احساس دلاتا ہے وہی مطالعہ بیک وقت اس خلاء کو پر بھی کر دیتا ہے۔

ایمان کا تیسرا جزو "خوف" ہے۔ یہ خوف ایمان کے ابتدائی دراجزہ۔ یقین اور اعتقاد سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کا لازمی نتیجہ اور اس کی تکمیل ہے۔ ایک طرف وہ خدا کو دیکھتا ہے جو عدل و حکمت کا خزانہ ہے۔ دوسری طرف کائنات کو دیکھتا ہے تو اس کا دل پکارا اٹھتا ہے کہ اتنا بڑا تخلیقی منصوبہ بے مقصد نہیں ہو سکتا۔ پھر جب وہ زمین پر بسنے والے انسانوں کو دیکھتا ہے جن میں ظالم بھی ہیں اور مظلوم بھی۔ اچھے

بھی ہیں اور برے بھی تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ محاسبہ کا ایک دن آنا ضروری ہے جہاں پتوں کو ان کی پکانی کا درجہ دیا جائے۔ رب العالمین پر اعتماد ہی اس کے لیے رب العالمین سے خوف کی بنیاد بن جاتا ہے۔

یہ خدا کا خوف اس قسم کی کوئی چیز نہیں ہے جو کسی ڈراؤنی چیز کو دیکھ کر آدمی کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جس کو کسی بھی ایک لفظ سے صحیح طور پر تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ یہ انتہائی امید اور انتہائی اندیشہ کی ایک ایسی ملی کیفیت ہے جس میں بندہ کبھی یہ طے نہیں کر پاتا کہ دونوں میں سے کس کو فوقیت دے۔ یہ سب کچھ کر کے اپنے کو کچھ نہ سمجھنے کا وہ اعلیٰ ترین احساس ہے جس میں آدمی کو صرف اپنی ذمہ داریاں یاد رہتی ہیں اور اپنے حقوق کو وہ بالکل بھول جاتا ہے۔ یہ محبت اور خوف کا ایک ایسا مقام ہے جس میں آدمی جس سے ڈرتا ہے اسی کی طرف بھاگتا ہے، جس سے چھینے کا خطرہ محسوس کرتا ہے اسی سے پانسے کی بھی امید رکھتا ہے یہ ایک ایسا اضطراب ہے جو سراپا اطمینان ہے اور ایسا اطمینان ہے جو سراپا اضطراب ہے۔

یہ ایمان کے تین نمایاں پہلو ہیں۔ ایمان دراصل اس کیفیت کا نام ہے جو خدا کے خوف، اس پر مکمل اعتماد اور اس کے بارہ میں کامل یقین سے پیدا ہوتا ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ پر، اس کے رسولوں پر اور اس کے احکام پر ایمان لائے، ان سب کچھ اس کو سوچ دے، اس کے تمام فیصلوں پر راضی ہو جائے وہ مومن ہے۔ ایمان عقل کے لیے ہدایت اور روشنی ہے اور دل کے لیے طہارت اور پاکیزگی۔ اس لیے عقل اور ارادہ دونوں کو ایک ساتھ متاثر کرتا ہے اور خیالات و اعمال سب پر حاوی ہو جاتا ہے۔ قرآن کی زبان میں مومن وہ شخص ہے جو خدا کا خالص اور وفادار بندہ ہے اور اس کے احکام پر یقین و اعتماد کی ساری کیفیات کے ساتھ اطاعت کا مادہ کرتا ہے۔

### ہجرت

اب ہجرت کو کیسے۔۔۔ ہجرت کے معنی ہیں چھوڑنا۔ ترک تعلق کرنا۔ عام طور پر ہجرت کو ترک وطن کے معنی سمجھا جاتا ہے۔ یقیناً ہجرت کا لفظ مخصوص طور پر جس واقعہ کے لیے بولا جاتا ہے وہ یہی ہے مگر کسی واقعہ کو اس کے پس منظر سے الگ کر کے سمجھا نہیں جاسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ترک وطن جو مومن کی زندگی میں پیش آتا ہے یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہوتا بلکہ ایک لمبی تاریخ کا اختتام ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جو مومن کی زندگی میں پہلے دن سے شروع ہوتا ہے اور بالآخر ترک علق تک پہنچ جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایک شخص پر حق کا انکشاف ہوتا ہے اور وہ اٹھ کر لوگوں کو اس کی طرف بلانا شروع کر دیتا ہے، وہ وقت کے خلاف ایک نئی آواز کا علمبردار بن کر گویا یہ اعلان کرتا ہے کہ اس نے اصول کی بندگی چھوڑ دی ہے اور زمانہ کے خلاف اپنے لیے ایک راہ بنانے کا فیصلہ کیا ہے، یہ ہجرت کا آغاز ہے جب

آدمی نامہائز زندگی کو چھوڑ کر جائز زندگی کو اپنانے کا عزم کرتا ہے۔ اس کے بعد ایک مسلسل جدوجہد شروع ہوتی ہے جس میں اس کو بہت سی پرانی چیزوں کو چھوڑنا اور بہت سی نئی چیزوں کو اختیار کرنا ہوتا ہے۔ کتنے ہی اپنے لوگوں سے کٹنا اور کتنے ہی غیروں سے جڑنا ہوتا ہے۔ اندر سے باہر تک بے شمار پسندیدہ چیزوں کو ترک کرنا اور اس کے بجائے دوسری ناخوش گوار چیزوں کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح ایسا لانے کے ساتھ ہی مومن کی زندگی میں ہجرت۔ ایک نیا طرز عمل اختیار کرنے کے لیے بہت سی پرانی چیزوں کو چھوڑنے کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ یہ ہجرت جو اس نے خود کی ہے دوسروں کو بھی اسی کی طرف بلانا شروع کر دیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں کچھ لوگ اس کا ساتھ دیتے ہیں اور کچھ مخالف بن جاتے ہیں۔ اس طرح ماحول میں دو باہل مقابل گروہ ابھرنے لگتے ہیں جن میں سے ایک گروہ اس چیز سے چٹھا ہوا رہتا ہے جس کو دوسرا گروہ چھوڑ دینا چاہتا ہے۔ یہ اختلاف صرف اس پہلو سے نہیں ہوتا کہ ایک گروہ دوسرے گروہ پر تنقید کرتا ہے اور اس کے ردیہ کو غلط قرار دیتا ہے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر دونوں کے درمیان ایک عملی کشمکش شروع ہو جاتی ہے انسانی معاشرہ ایک وحدت ہے جس میں کوئی شخص دوسرے تمام لوگوں سے الگ اپنے لیے کوئی راہ نہیں بنا سکتا۔ انسان اپنی عین فطرت کے اعتبار سے سماجی واقع ہوا ہے۔ اس کی تمام ضرورتیں دوسروں سے مل جل کر انجام پاتی ہیں اور اس کو دوسروں کے پھیلائے ہوئے نظریات کے درمیان زندگی بسر کرنی ہوتی ہے۔ کوئی شخص اپنے پسند کیے ہوئے نظریہ کے مطابق زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ جب تک وہ سماج کے تمام اداروں میں اسی نظریہ کو رائج نہ کر لے۔ اس کے بغیر نہ تو وہ مدرسہ میں اپنی مرضی کے مطابق تعلیم حاصل کر سکتا نہ بازار میں اپنی مرضی کے مطابق خرید و فروخت کر سکتا۔ نہ عدالتوں سے اپنے اصول کے مطابق فیصلے لے سکتا۔ حتیٰ کہ وہ یہ بھی نہیں کر سکتا کہ جس چیز کو وہ حلال سمجھتا ہے اسے کھائے اور جو چیزیں اس کے نزدیک حرام ہیں ان کو اپنے حلق کے نیچے اترنے نہ دے۔ اس لیے جب کوئی شخص وقت کے خلاف کسی مسلک کو اختیار کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کا یہ فیصلہ لازمی طور پر ان لوگوں سے ٹکراؤ کا سبب بن جاتا ہے جن کے بنائے ہوئے نظام کے اندر وہ زندگی گزار رہا ہے۔ انسانی معاشرہ کی مثال ایک جال کی سی ہے جس کے تمام افراد جالوں کی مانند ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک حلقہ کو الگ کرنے کی کوشش پورے جال کو جھجھوڑ دیتی ہے۔ اس طرح ایک مستقل اختلاف شروع ہو جاتا ہے جو دن نمایاں ہوتا جاتا ہے۔ قدم قدم پر ایک دوسرے سے مزاحمت پیش آتی ہے۔ جس میں برسرِ اقتدار طبقہ اہل حق کو تسانے اور ان کو ذرائع حیات سے محروم کرنے کی ساری تدبیریں کرتا ہے۔ دونوں طرف سے شدت بڑھتی چلی جاتی ہے ایک طرف مظالم کی شدت۔ دوسری طرف یہ شدت کہ سب کچھ سہیں گے مگر اپنے عزم کو ترک نہیں کریں گے۔ جس چیز کو غلط سمجھ کر ایک بار چھوڑ چکے ہیں اس کی طرف دوبارہ واپس نہیں جائیں گے۔ کیش کش بالآخر ایک ایسے نقطے پر پہنچ جاتی ہے جہاں معاشرہ حق پسندوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے اور یہ فیصلہ

کرتا ہے کہ ان کے وجود کو سرے سے ختم کر دیا جائے، اس وقت اہل حق یہ طے کرتے ہیں کہ اس سبھی کو چھوڑ کر زمین کے کسی دوسرے ٹکڑے میں چلے جائیں۔ پہلے انھوں نے غلط خیالات اور حرام معاملات کو ترک کیا تھا۔ اب وہ اپنے مکان، اپنی جائیداد اپنے عزیزوں، غرض ساری متاع حیات کو چھوڑ دیتے ہیں یہ ہجرت کی آخری اور انتہائی شکل ہے۔

اس ہجرت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک مقام کو چھوڑ کر آدمی دوسرے مقام پر چلا گیا، بلکہ یہ حق کو چھوڑ کر حق کی طرف بڑھنا ہے۔ یہ شیطان اور طاغوت کی بندشوں سے نکل کر خدا کی طرف بھاگنا ہے۔ چنانچہ قرآن وحدیث میں مؤمنین کی ہجرت کو "ہجرت الی اللہ" کہا گیا ہے یعنی خدا کی طرف ہجرت۔ ایسا کیوں ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ لوگ زمین کو چھوڑ کر آسمان پر نہیں چلے جاتے بلکہ اسی دنیا میں رہتے ہیں، ایسا کہنے کی وجہ یہ ہے کہ چھوڑنے کا یہ عمل خرابی کے نتیجے میں ہوتا ہے۔ خدا کی طرف ہجرت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی راہ میں جو کچھ مانع آئے، جو چیز بھی اس کی طرف بڑھنے میں رکاوٹ بنے اس کو چھوڑ دینا، یہ خدا پرستانہ زندگی کی بنیاد ہے جب تک آدمی اس ہجرت کے لیے تیار نہ ہو وہ ایمان کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا، اپنی زندگی کو اسلامی زندگی بنانے میں وہی کامیاب ہو سکتا ہے جو اس قربانی کے لیے تیار ہو جب وہ دیکھے کہ اس کے اندر ایسے انکار اور رجحانات پرورش پارہے ہیں جو خدا کی مرضی کے خلاف ہیں تو انہیں کھریج کر نکال دے۔ اگر وہ غلط اعمال میں مبتلا ہو تو انہیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے۔ کسی کا تعلق دین کی طرف کھل کر آنے میں رک بن رہا ہو تو ایسے تعلق کو خیر باد کہہ دے۔ کسی میاں زندگی کو برقرار رکھنے کا سہلہ دین کے کام میں اپنا حصہ ادا کرنے کا موقع نہ دیتا ہو تو ایسے میاں زندگی کو دفن کر دے۔ دین کے تقاضے پورے کرنے میں مانتی خوشحالی کو خطرہ لاحق ہو تو اس کو گوارا کر لے۔ اپنے آپ کو خدمت دین کے لیے وقف کرنے میں اپنا اور بچوں کا مستقبل تاریک نظر آتا ہو تو اس کی پرواہ کیے بغیر آگے بڑھ جائے۔ غرض ہر بار جب آدمی کسی ایسی حالت میں مبتلا ہو کہ ایک طرف خدا بلارہا ہو اور دوسری طرف کوئی دوسرا تقاضا آدمی کو کھینچ رہا ہو تو دوسرے تقاضوں کو چھوڑ کر خدا کی طرف بڑھ جانا۔ اسی کا نام ہجرت الی اللہ ہے۔

اس ہجرت کے بہت سے مراحل اور اس کی بے شمار قسمیں ہیں مگر اس کی حقیقت سمجھنے کے لیے ہم اس کو دو بڑے عنوانات میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک ناجائز اور حرام چیزوں کو چھوڑنا اور دوسرے ان چیزوں کو چھوڑنا جو فی نفسہ قابلِ اعتبار نہیں ہیں۔ مگر دین کو اختیار کرنے کے نتیجے میں ایسے مراحل آتے ہیں کہ مومن کو ان سے بھی دست بردار ہونا پڑتا ہے۔

ہجرت کی پہلی قسم میں خیالات اور اعمال کی وہ پوری فہرست آتی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام اور قابلِ ترک قرار دیا ہے ہر آدمی کسی ماحول میں پیدا ہوتا ہے ماحول نام ہے تاریخ، روایات، عادات اور چال چلن کے ایک مخصوص ڈھانچہ کا۔ یہ انکار و اعمال کا ایک نظام ہے جو زندگی کے تمام گوشوں پر چھایا ہوا

رہتا ہے جس طرح زمین کے گولے کے گرد ہوا کا ایک غیر مرئی غلاف ہے جس میں ہم سب لوگ ڈوبے ہوئے ہیں۔ تھیک اسی طرح ہر سیلابی ہونے والا اپنے وقت کے ماحول میں ڈوبا ہوا پیدا ہوتا ہے۔ اسی کے اندر اس کی نشوونما ہوتی ہے۔ ماحول کے انکار اور ردایات اس کی رگ رگ میں پیوست ہو جاتے ہیں اور اکثر اوقات ان کے خلاف سوچنا اس کے لیے دشوار ہو جاتا ہے جب آدمی برحق کا احساس ہوتا ہے تو سب سے پہلے اس دین آباء کو چھوڑنے کا مرحلہ سامنے آتا ہے۔ اس کو ان تمام غلط اثرات کو کھرج کر اپنے اندر سے نکال دینا ہوتا ہے جو ماحول کے اثر سے اس نے قبول کر رکھے تھے۔ پھر ہر آدمی کے اندر ایک نفس ہوتا ہے، یہ نفس ہر لذتوں کو ڈھونڈتا ہے۔ اس کے نزدیک کسی چیز کو پسند یا ناپسند کرنے کا معیار یہ نہیں ہے کہ وہ صحیح ہے یا غلط! اچھی ہے یا بری۔ بلکہ اس کے نزدیک پسندیدگی کا معیار صرف یہ ہے کہ وہ اسے اچھی لگتی ہے اور اس کے ذریعے سے اس کو فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ آدمی اپنی جاہلی زندگی میں بہت سی ایسی چیزیں اور مخلوقات کو اپنے اندر جمع کر لیتا ہے جو اگرچہ غلط ہیں مگر اس کے نفس کو پسند آتے ہیں۔ اسی طرح وہ بہت سی ایسی ذمہ داریوں کو بھلا دیتا ہے اور انہیں ترک کر دیتا ہے جو اگرچہ اخلاقاً اس کے لیے ضروری ہیں، مگر اس کے نفس کو پسند نہیں آتیں۔ اس لیے جب کوئی شخص ایمان لاتا ہے تو اس کو اپنی زندگی میں نکتہ د رعیت کا ایک مستقل عمل جاری کرنا پڑتا ہے، بہت سی چیزیں جن سے اسے نفرت تھی جن سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی، ان کو اپنی زندگی میں شامل کرنا ہوتا ہے، اس طرح ایمان لانے کے بعد غلط جذبات، غلط تعلقات اور غلط اعمال سے جدائی کی ایک مستقل ہم شروع ہو جاتی ہے زندگی کے تمام معاملات میں ناجائز طریقوں سے بچنے کا ایک پیہم عمل کرنا ہوتا ہے جو موت کی آخری گھڑی تک جاری رہتا ہے یہ ہجرت کی پہلی اور ابتدائی قسم ہے جو ماضی کے غلط عادات و اطوار سے اپنے کو پاک کرنے اور آئندہ اس طرح کی کوئی چیز قبول نہ کرنے کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس ہجرت کا ذکر قرآن میں سورہ مدثر میں کیا گیا ہے جو نبوت کے باطل ابتدائی زمانے کی سورہ ہے۔ فرما!

وَالَّذِينَ آمَنُوا  
(مدثر: ۵)

گندگی سے ہجرت کر دینی خیال اور عمل کی تمام برائیوں کو چھوڑ دینا

یہی بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مندرجہ ذیل الفاظ میں واضح فرمائی ہے۔

أَلَمْ تَجِدْ رَجُلًا مِّنْهُمْ يَأْتِي اللَّهَ عَنِّي - مہاجر وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ نے منع کیا ہے۔

یہ ہجرت الی اللہ کا ایک پہلو ہے جس میں آدمی کو تمام ناجائز چیزیں چھوڑ دینی ہوتی ہیں۔ خدا کی مرضی

کے مطابق بننے کے لیے ان چیزوں سے اپنے کو پاک کرنا ہوتا ہے جو خدا کی مرضی کے خلاف ہیں۔ اس کا دوسرا پہلو وہ ہے جس میں آدمی مجبور ہوتا ہے کہ اپنے جائز مفادات بھی خدا کی راہ میں قربان کر دے۔ ایسا اس لیے ہے کہ اسلام آدمی کو کرنے کا اتنا بڑا کام دے دیتا ہے کہ اس کے بعد پھر اسے کچھ اور کرنے کا موقع باقی نہیں رہتا۔ اس کی توجہات اپنی ذات سے ہٹ کر مہربان اسلام کی طرف لگ جاتی ہیں۔ اسی

ایسے کہا گیا ہے کہ دنیا کے اندر مومن کی صرف ذمہ داریاں ہیں۔ یہاں اس کا کوئی حق نہیں ہے اس کا جو کچھ حق ہے وہ خدا کے یہاں ہے اور وہیں وہ اسے پائے گا۔

اسلام کو قبول کرنے کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ آدمی اپنی زندگی میں اس کو اختیار کر لے۔ بلکہ اس کی ساتھ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ دوسروں کو اس کی طرف بلائے اور پورے معاشرہ میں اس کو قائم کرنے کی جدوجہد کرے۔ دین کا یہ دوسرا تقاضا ہماری ذمہ داری کو صرف دگنا نہیں کرتا بلکہ اس کو انتہائی حد تک دشوار بنا دیتا ہے۔ اگرچہ انفرادی زندگی میں ممکن حد تک دین کو اختیار کرنا بھی کچھ آسان کام نہیں ہے۔ یہ نعمتوں سے بھری ہوئی دنیا میں اپنے اختیار اور اپنے ارادہ کو صرف صحیح سمت میں استعمال کرنا ہے۔ یہ خود مختار ہو کر اپنی مرضی سے اپنے آپ کو پابند بنالینا ہے اور موت کی آخری گھنٹی تک پابند بنائے رکھنا ہے۔ مگر دین کا دوسرا تقاضا۔ یعنی دوسرے بندگان خدا تک خدا کے پیغام کو پہنچانا اور اس کے دین کو علما زین کے اوپر رائج کرنے کی جدوجہد کرنا۔ یہ اتنا آسان بار تقاضا ہے کہ اس کا تصور بھی آدمی کو لرزادینے کے لیے کافی ہے۔ یہ ایک ایسا عظیم اور جاں نسل کام ہے جو اس کی ساری قوت اور اس کا سب کچھ مانگتا ہے۔ ذہن اور ارشادیت دین کے علاوہ کسی کام میں وہ جتنا وقت اور قوت بھی صرف کرے گا اس کے معنی یہ ہیں کہ آدمی کے بقدر وہ اصل فرضیہ کی ادائیگی میں کمی کر رہا ہے۔

آدمی جب اس حیثیت سے دین کو قبول کرتا ہے تو وہ فوراً محسوس کرتا ہے کہ اس کام میں اپنا حصہ ادا کرنے کے معنی یہ ہیں کہ میں اور کچھ نہ کروں۔ وہ اپنے لیے اس کے سوا اور کوئی راہ نہیں پاتا کہ اپنی ضرورتوں کو انتہائی حد تک مختصر کر دے۔ دنیا کے اندر اپنی تباہیوں کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دے اور اپنی ذات کے لیے کم سے مصروف رہ کر حق کی زیادہ سے زیادہ خدمت انجام دے۔ وہ مجبور ہوتا ہے کہ بالکل ناگزیر ضروریات کی فراہمی کے بعد جو وقت بھی ملے اس کو شہادت دین کی راہ میں لگا دے۔ دوسرے لفظوں میں اسلام کو اپنی انفرادی زندگی میں اختیار کرنا ہو تو صرف حرام چیزوں کو چھوڑ کر بھی کوئی شخص دیندار بن سکتا ہے مگر اسلام کو اجتماعی زندگی میں اختیار کرنے کی ہم شروعات کیجیے تو آپ کو بہت سی حلال چیزوں سے بھی دستبردار ہونا پڑے گا۔ اس کے بغیر صحیح طور پر اس کام کی ابتدا بھی نہیں کی جاسکتی۔ اس کو انجام تک پہنچانا تو بہت دیر کی بات ہے۔

پہلی صورت میں آدمی کے اوپر صرف اس کی اپنی ذمہ داری ہوتی ہے اور دوسری صورت میں وہ ساری خلق تک پیغام حق پہنچانے کا ذمہ دار بن جاتا ہے۔ یہ چیز آپ کی مصروفیتوں اور دقتوں میں بے پناہ اضافہ کرتی ہے اس کا تقاضا ہے کہ آپ اسلام کے برحق ہونے اور اس کے سوا دوسرے تمام افکار و نظریات کے ناحق ہونے کا بے پناہ یقین پیدا کریں تاکہ آپ اس کے پرچم سے ملنے بن سکیں۔ آپ کو اسلام کا تفصیلی علم حاصل کرنا ہے تاکہ دوسروں کے سامنے اس کو واضح انداز میں پیش کر سکیں۔ آپ کو ان غلط افکار و نظریات کے خلاف دلائل فراہم

کرنے ہیں جنہوں نے انسانی ذہنوں کو متاثر کر رکھا ہے تاکہ باطل کو چھوڑ کر لوگوں کو حق کی طرف آنے پر آمادہ کیا جاسکے۔ آپ کو ایک ایک شخص تک پہنچانا ہے اور اس کی نغیبات اس کے حالات اور اس کی قوت فہم کے مطابق اسے بات سمجھانی ہے۔ آپ کو اسلامی اخلاق کا نہایت اعلیٰ نمونہ بنانا ہے تاکہ آپ کی زندگی آپ کے دعوے کی تردید کرنے والی نہ ہو بلکہ اس کی صداقت پر گواہ ہو بغرض فرض کی ایک عظیم فہرست ہے جو آپ سے آپ کی پوری عمر اور آپ کا پورا اثاثہ مانگتی ہے۔ پھر ایسے فرض کو ادا کرنے کی ذمہ داری اڈھنے کے بعد کسی دوسری چیز میں ڈپٹی لینے کا موقع کہاں باقی رہتا ہے۔

یہ ہجرت کی دوسری قسم ہے یعنی دین کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اپنی ذات کے تقاضوں کو چھوڑنا جب دین کی ضروریات اور اپنی ضروریات میں ٹکراؤ ہو، جب دین کا کام آپ سے آپ کا پورا وقت اور آپ کی ساری صلاحیتیں مانگتا ہو۔ جب دین کا تقاضا یہ ہو کہ آپ اپنی خوشی اپنا آرام اور اپنے عزیز و اقارب تک کو چھوڑ کر اس کی طرف بڑھیں تو آپ اپنا سب کچھ اس کے لیے قربان کر دیں اور کوئی چیز بھی ایسی نہ ہو جس کا تعلق آپ کو دین کی طرف جانے میں رک رک بن جائے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو مندرجہ ذیل آیت میں بیان کی گئی ہے۔

اے نبی بردو! اگر تمہارے باپ تمہارے بیٹے تمہارے بھائی، تمہاری میواں اور تمہاری برادری کے لوگ اور وہ مال جو تم نے کما لے ہیں اور تجارت جس کے ماڈ پڑنے کا نہیں ڈر لگا رہتا ہے اور مکانات جو تم کو پسند ہیں اگر یہ تم کو خدا اور رسول سے زیادہ محبوب ہیں اور خدا کی راہ میں جہاد کرنے کے مقابلہ میں تم کو ان چیزوں سے زیادہ شیعگی ہے تو انتظار کرو، یہاں تک کہ خدا کا فیصلہ آجائے

قُلْ إِنِّي كَانُ أَمَانًا تُكْفَرُ وَأَنَا تَوَكَّلُ عَلَى اللَّهِ وَهُوَ يُكَفِّرُ مَا يَشَاءُ وَلَا يَذَرُ أَشْيَاءَ ۚ وَأَسْأَلُ بِمَا أُعْتِرُكُمْ بِهَا وَشَجَرًا شَاكِسًا وَكُنُوزًا وَمَسَاكِينًا رَضُوا نَحْمًا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرْتَصِفُونَ أَيَّاتِي اللَّهُ بِأَمْرٍ لَّوَاللَّهِ لَا يُغَيِّرُ الْقُلُوبَ إِلَّا الْقَلِيلِينَ ۝

توبہ - ۲۴

اور اللہ ناسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

اس آیت میں جن چیزوں کا ذکر ہے وہ سب کی سب سب جائز ہیں اور ان میں سے کوئی بھی فی نفسہ حرام نہیں ہے مگر مؤمنین سے کہا گیا ہے کہ ان سب کو چھوڑ کر خدا کی طرف بڑھیں اور جو لوگ ایسا نہ کریں وہ ناسق یعنی مہین اقرار دیے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ مطالبہ ہمارے پیش رو حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے کیا تھا جنہوں نے نبی آخر الزماں کے ذریعہ اپنے رب سے یہ عہد کیا تھا کہ وہ دین کو سر بلند کرنے کی جدوجہد میں اپنی ساری قوت لگا دیں گے۔ جب صحابہ کرام کے اس عہد پڑوس سال کی مدت گزر گئی اور انہوں نے مسلسل قربانیوں کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا کہ وہ دین کی خاطر اپنا سب کچھ چھوڑنے کے لیے تیار ہیں تو غرضہ تک سے واپسی کے بعد ۹ھ میں اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل الفاظ میں ان کی کوششوں کی قبولیت کا اعلان فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ و  
 أَمْوَالَهُمْ بِأَن لَهُمَ الْجَنَّةَ ۖ يُفَقِّتُونَ فِيهَا  
 سُبُلَ اللَّهِ لِيُقَاتَلُوا وَيُقَاتِلُوا وَعَدَّ اللَّهُ  
 حَقًّا فِي الْقَوْلِ ۖ وَالْذِّمَّةُ وَالْقُرْآنُ ۚ وَمَنْ  
 أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ مِنَّا فَسَبِّحْهُ ۗ وَابْتَغِ الْوَعْدَ  
 الَّذِي بَالَعْتُمْ بِهِ ۖ وَذَلِكُمْ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝

اللہ نے مؤمنین سے ان کی جانوں اور مالوں کو خرید لیا ہے  
 اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنت ہے وہ اللہ کی راہ میں لڑتے  
 رہیں، پھر ہار تے رہیں اور ہارے جاتے رہیں۔  
 یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے، تورات میں انجیل میں اور قرآن میں  
 اور اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کو پورا کرنے والا کون ہے پس  
 خوش ہواؤ! اپنے اس سودے پر جو تم نے اللہ سے کیا ہے اور  
 یہی بڑی کامیابی ہے۔

(توبہ — ۱۱۱)

یہ ہجرت یا دوسرے نفعوں میں جانز مفلوات کی قربانی انسان کی خدا پرستی کا امتحان بھی ہے اور اسی کے  
 ذریعہ سے خدا کا دین بھی خدا کی زمین پر قائم ہوتا ہے۔ یہ اعلا کلمۃ اللہ کی جدوجہد کا لازمہ ہے۔ جو لوگ اس کام میں  
 حصہ لینے کے لیے آگے بڑھیں مگر ان کا حال یہ ہو کہ وہ دنیا میں اپنا مقام محفوظ کر لینے کے بعد آخرت کا کام کرنا چاہتے  
 ہوں، جو اپنے میاں زندگی کو گھٹانے پر تیار نہ ہوں، جو اپنے بچوں کے مستقبل کو خطرے میں ڈالنا گوارا نہ کریں، جو  
 دنیوی زندگی میں اپنی تنہاؤں اور خواہشوں کو قربان نہ کریں، جو یہ نہ سوچیں کہ اپنی معاشی مصروفیات میں کمی کر کے  
 دین کی خدمت کے لیے اور زیادہ وقت نکالنا چاہیے بلکہ اس کے برعکس جو ہمیشہ یہ سوچتے ہوں کہ کس طرح اور  
 کوئی بڑا کام مل جائے تاکہ اسے بڑھے ہوئے اخراجات کو پورا کیا جاسکے۔ مختصر یہ کہ جن کے اندر اتنا حوصلہ نہ ہو کہ  
 وہ آج کے فائدے پر کل کے فائدے کو ترجیح دے سکیں۔ ایسے لوگوں نے کبھی تاریخ میں دین کو سربلند نہیں کیا ہے  
 اور جب تک یہ زمین و آسمان قائم ہیں آئندہ بھی ایسے لوگوں کے ہاتھوں یہ کام نہیں ہو سکتا۔

### جہاد

اب جہاد کو میسجیہ جہاد کے معنی میں کسی چیز کے لیے اپنی آخری کوشش صرف کرنا۔ اتنی کوشش کرنا کہ آدمی تھک  
 جائے۔ ہجرت کی طرح یہ جہاد بھی کئی قسمی کارروائی کا نام نہیں ہے بلکہ ایک ایسا عمل ہے جس کا تعلق ساری  
 زندگی سے ہے۔ جہاد صرف میدان جنگ میں نہیں ہوتا بلکہ ایمان لانے کے بعد ہی سے اس کا سلسلہ شروع ہو جاتا  
 ہے اور زندگی کے آخر لمحات تک جاری رہتا ہے۔ ایک غیر اسلامی معاشرہ میں جہاد کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسی  
 مائیکس کے جدلیاتی فلسفہ میں ایک نظام کے اندر اس کے ضد کی ہوتی ہے۔ یہ ایک زبردست چیلنج ہے جو کسی نظام کے اندر  
 اس کے عدو کی حیثیت سے ظاہر ہوتا ہے۔ جاہلی معاشرہ میں کسی کا اسلام قبول کرنا دراصل وقت کے خلاف فیصلہ  
 کرنا ہے۔ یہ فیصلہ اگر صحیح شعور اور مکمل عزم کے ساتھ ہو تو بالکل لازمی نتیجہ کے طور پر معاشرہ کے ہر فرد اور اس کے تمام  
 اداروں سے اس کا ٹکراؤ شروع ہو جاتا ہے۔ ایک طرف وقت کا معاشرہ ہوتا ہے جو اپنے تمام نظری اور عملی پہلوؤں  
 کے اعتبار سے زندگی کے تمام شعبوں پر چھایا ہوا ہوتا ہے دوسری طرف یہ صاحب ایمان ہوتا ہے جو اس سے مختلف  
 ایک اور ہی طرز زندگی کو اپنے گرد و پیش کی دنیا میں دکھینا چاہتا ہے۔ اولیٰ کے ساتھ اس کا یہ اختلاف اس کو ایک

یہی تیز گریس کی مانند بنا دیتا ہے جو کسی محدود دخل کے اندر بند ہوا درہر آن اس سے نکلنے کے لیے بے قرار ہو۔ یہ کشش اور جذبہ جہد کا عمل آدمی کے اپنے نفس سے شروع ہوتا ہے اور تمدن کے مختلف گوشوں میں پھیلنا ہوا ہر اس معاملہ تک پہنچ جاتا ہے جس کا تعلق انسانی زندگی سے ہو۔ یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے اور دن بدن تیز سے تیز تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آتا ہے جب کشش اپنے آخری نقطے پر پہنچ جاتی ہے۔ بلوٹ کا بند ٹوٹ جاتا ہے اور جاہلی نظام شکست کھا کر اسلام کے لیے جگہ خالی کر دیتا ہے۔

جہاد کی اصل حقیقت خدا کی راہ میں چلنے کے لیے اپنے آپ کو تھکانا ہے۔ قرآن میں خدا کے دین کو "جہاد" کہا گیا ہے جس کے معنی بلند مقام کے ہیں اور اس دین پر عمل کرنے کو ادنیٰ پر چڑھنے سے تشبیہ دی گئی ہے (پلہ ۱۱-۱۰)۔ اس مثال سے ہم جہاد کی حقیقت سمجھ سکتے ہیں۔ دنیا میں زندگی گزارنے کی صرف دو راہیں ہیں۔ ایک نفس کی خواہش کے مطابق اور دوسری خدا کی مرضی کے مطابق۔ ایک غیر ذمہ دارانہ زندگی ہے اور دوسری ذمہ دارانہ زندگی۔ پہلی راہ بے حد آسان ہے اور دوسری راہ بے حد دشوار۔ پہلی صورت میں ادھر سے نیچے آنا ہوتا ہے اور دوسری صورت میں نیچے سے اوپر جانا۔ گاڑی کو ڈھلوان راستے پر چھوڑ دیکھتے تو وہ خود بخود لڑھکتی چلی جائے گی۔ اس کے لیے کسی زیر مہولی کو شش کی ضرورت نہیں ہوگی۔ لیکن اگر اسی گاڑی کو کسی بلندی پر چڑھانا ہو تو مسلح محنت کی ضرورت ہے۔ ایک تھکا دینے والی مشقت کے بغیر کوئی شخص اپنی گاڑی کو نیچے سے اوپر نہیں لے جاسکتا۔ یہی عمل جب وقت اور خواہش کے خلاف اپنی زندگی کو خدا کی طرف لے جانے کے لیے کیا جائے تو اس کو ہم جہاد کہتے ہیں۔

انسان جب یہ فیصلہ کرتا ہے کہ وہ خدا کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرے گا، تو اس کو فوراً معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دو ایسی طاقتیں ہیں جو اس کے اس ارادہ کی راہ میں زبردست روک ہیں۔ ایک خود اس کا اپنا نفس دوسرے طاغوت۔ نفس سے مراد انسان کا یہ جذبہ ہے کہ وہ ہر حال میں اپنے لیے لذت اور آرام کو پسند کرتا ہے۔ اس کو ہمیشہ آسانی کی تلاش رہتی ہے وہ عورت اور برتری حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتا کہ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے بلکہ جدھر اس کا جی چاہتا ہے اس طرف نکل جاتا ہے۔ یہ جذبہ اس کو اگسا تا ہے کہ ہر وہ کام کرے جس سے اس کی ان خواہشوں کو تسکین ملتی ہو اور ایسا کوئی کام نہ کرے جس سے اس کی ان خواہشوں پر ضرب پڑے۔ اور طاغوت سے مراد خارج کا وہ غلط اقتدار ہے جو ماحول کی روایات، وقت کے نظریات اور عوام الناس کی خواہشوں کی صورت میں آدمی کے اوپر دباؤ ڈالتا ہے۔ یہ طاغوت افراد کی زندگی میں متکبرانہ روش کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور اجتماعی زندگی میں غیر خدائی اقتدار کی صورت میں۔ یہ خارجی قوتیں براہ راست بھی مزاحمت کرتی ہیں اور بالواسطہ بھی بالواسطہ اس طرح کہ سوسائٹی پر ملنا تا بغض ہونے کی وجہ سے زندگی کے تمام گوشوں میں انہیں کے نظریات پھیل جاتے ہیں۔ انسان کے لیے اس کے سوا کوئی شکل نہیں ہوتی کہ ان کو ماننے اور اپنے آپ کو ان سے لوث کرے، اس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور براہ راست اس لیے کہ اس طرح کے ایک ماحول میں حتیٰ پر چلنے کا ارادہ ان قوتوں

کے پیچھے کی حیثیت رکھتا ہے وہ راج الوقت نظام کے لیے موت کی پیشین گوئی ہے۔ اس لیے جو لوگ اس قسم کا ارادہ لے کر اٹھتے ہیں وہ ان کو روکنے اور ان کو کچل دینے کے لیے اپنا پورا زور صرف کرتی ہیں اور اپنے دائرہ میں ان کو زندگی کے مواقع سے محروم کر کے رکھ دیتی ہیں۔

ان حالات میں جب کوئی شخص خدا کی طرف بڑھتا ہے تو اس کو اپنے اندر سے لے کر باہر تک خیالات سے لے کر عمل کی دنیا تک قدم قدم پر تیار رکاوٹوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ کہیں آرام کے مقابلہ میں تکلیف گوارا کرنا ہوتا ہے، کہیں ایک لذیذ رجحان کو چھوڑنے اور ایک خشک عقیدہ کو قبول کرنے کے لیے کش مکش کرنی پڑتی ہے۔ کہیں ملتے ہوئے ناجائز فائدوں کے ٹھہر کے بجائے ایک حقیر حاصل پر آمادہ ہونے کے لیے اپنے آپ سے زبردستی کرنی پڑتی ہے۔ کہیں عورت اور ناموسری کے بجائے گم نامی اور ذلت پر قانع ہونے کے لیے مجاہدہ کرنا ہوتا ہے۔ کہیں اپنے جائز حقوق اور اپنے واقعی مفادات سے محرومی پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ غرض اس کے سامنے وہ مختلف راہیں کھلی ہوتی ہیں اور اس کو پورا اختیار ہوتا ہے کہ جوہر چاہے چلا جائے۔ ایک طرف جانے میں دنیا کی ہر چیز ملتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور دوسری طرف جانے میں نظاں کچھ بھی ملتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ اس کا نقص مجبور کرنا ہے کہ آسان راستہ کی طرف جانے۔ خارجی قوتیں اس مقصد کے لیے اپنا پورا وزن اس کے اوپر ڈال دیتی ہیں۔ مگر وہ ان ساری مزاحمتوں کے باوجود آسان اور پر لطف راستے کو چھوڑ دیتا ہے اور کھینچ کر اپنے کو مشکل راستہ کی طرف لے جاتا ہے۔ اسی کش مکش کا نام جہاد ہے۔

جس چیز کو ہم اجتماعی انقلاب کہتے ہیں وہ بھی اسی کش مکش کا ایک تدریجی نتیجہ ہے جس کے بعد ماحول پر اسلام کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اجتماعی انقلاب برپا کرنا اسلام کا اصل مقصد ہے۔ کوئی کہتا ہے یہ مقصد نہیں بلکہ ذریعہ ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک مسلسل عمل کا آخری انجام ہے۔ اسلام کے مطابق جینے اور مرنے کا ارادہ جو ابتداً قلب کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ وہ جب عمل کی صورت اختیار کرتا ہے اور ذہن سے نکل کر ماحول میں پھیلنا شروع ہوتا ہے تو اسی پھیلاؤ کے ایک مخصوص دائرہ کو ہم اجتماعی انقلاب کہتے ہیں۔ انقلاب کو مصنوبی دخت کی طرح اگایا نہیں جا سکتا اور نہ اس کو بور یوں میں بھر کر کہیں باہر سے لایا جاتا ہے بلکہ وہ ایک عمل کے طبیعی نتیجہ کے طور پر خود پائی زمین سے ابھرتا ہے۔ جس طرح اٹڈے کے اندر ایک زندہ بچہ کا وجود یہ منی رکھتا ہے کہ ایک ایک روز اوپر کا نول ٹوٹ جائے اور جیبا جاتا ہے اس کے باہر آجائے۔ ٹھیک اسی طرح مخالف ماحول کے اندر ایک اسلامی گروہ کی موجودگی اس کے لیے موت کا حکم رکھتی ہے۔ اگر یہ گروہ اپنے ایمان میں غلصہ ہے اور عقیدہ کو عمل کی شکل دینے کا سچا عزم رکھتا ہے تو اس کے منی یہ ہیں کہ وہ ہر آن باطل کی دیوار کو مترنزل کر رہا ہے۔ ایسا ایک گروہ لازمی طور پر دیوار کو توڑ دے گا۔ وہ اس کے اندر نہیں بٹھر سکتا۔

جہاد ہر اس رکاوٹ سے لڑنے اور اس سے کش مکش کرنے کا نام ہے جو دین پر عمل کرنے کے سلسلے میں پیش آئے اور چونکہ یہ رکاوٹ انسان کے اندر سے بھی ہوتی ہے اور باہر سے بھی، اس لیے جہاد میں آدمی کبھی خود



آخری سرمایہ تک قربان کر دے۔

قرآن کی اسی بتائی ہوئی زندگی کو پورا کرنے یا نہ کرنے پر ہمارے مستقبل کا انحصار ہے۔ ایک شخص جو اس حقیقت کو جان چکا ہو کہ اس دنیا کا ایک خدا ہے، اور پھر جو اس واقعہ پر بھی ایمان لایا ہو کہ آخرت کا ایک عظیم دن آنے والا ہے جب پوری نسل انسانی خدا کی عدالت میں گھڑی کی جائے گی۔ اس کی خواہش اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ قیامت کے اس ہولناک دن، جب وہ مالک کائنات کے سامنے کھڑا ہو تو اس کے بارہ میں اللہ تعالیٰ یہ کہہ دے کہ یہ میرا بندہ ہے جو دنیا کی زندگی میں میرا وفادار رہا۔ مگر یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ مقام کسی کو محض خواہش کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکتا۔ دنیا کی معمولی حکومتوں کا یہ حال ہے کہ وہ کسی کو وفاداری کا سرٹیفکیٹ صرف اس وقت دیتی ہیں جب کہ وہ اس کا دین، اخلاق اور ضمیر سب کچھ اس سے خرید لیتی ہیں۔ پھر خدا جو تمام حاکموں کا حاکم ہے، جو بے حد غیرت مند ہے جو اپنی خدائی کسی کی معمولی شرکت بھی گوارا نہیں کرتا، وہ کیا محض دل کی ایک خواہش یا زبان کی حرکت سے خوش ہو جائے گا اور کسی کو محض اس بنا پر وفاداری کا اعزاز بخش دے گا کہ وہ ایسا چاہتا ہے، خواہ اس نے اپنی وفاداری کو عملاً اس کے لیے خاص کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسری تمام وفاداریوں کی طرح خدا کا وفادار بننے کی خواہش بھی ایک غلطی پر جذبہ کا تقاضا کرتی ہے۔ دنیا کے اداروں میں کسی کی اہمیت صرف اس وقت تسلیم کی جاتی ہے جب وہ اپنی بہترین صلاحیتیں اس کے لیے وقف کر دے۔ ایک دکان اپنے اندر نفع کے امکانات کسی کے اوپر صرف اس وقت ظاہر کرتی ہے جب آدمی اپنا سب کچھ اسے دے دیتا ہے۔ حکومتوں کے نزدیک کوئی شخص صرف اسی وقت اعتماد اور احترام کا مستحق بنتا ہے جب وہ اپنے آپ کو پوری طرح اس کی نذر کر چکا ہو۔ ٹھیک اسی طرح اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی وفاداری کا مقام صرف اسے حاصل ہوتا ہے جو اپنی قربانیوں کے ذریعہ اس کا اطمینان ثابت کر دے۔ شرک نہ دنیا کے مسودوں کو پسند ہے اور نہ خدا کو۔

اس حقیقت کو سامنے رکھیے اور پھر اس دن کا تصور کیجیے جب ہم اور آپ اور تمام اگلے پچھلے پیدا ہونے والے خدا کے پاس اس حال میں جمع کیے جائیں گے کہ ایک رب العالمین کے سوا سب کی آوازیں بہت مہمچی ہوں گی۔ جس دن آدمی اپنے سوا ہر ایک کو بھول جائے گا۔ خواہ وہ اس کا دوست اور قریب ترین عزیز ہو۔ نہ ہو۔ جس دن صرف حق بات میں وزن ہوگا اور اس کے سوا تمام چیزیں اپنا وزن کھو بیگی ہوں گی۔ جس روز آدمی حسرت کرے گا کہ کاش اس نے ساری عمر صرف آج کی تیاری میں صرف کر دی ہوئی۔ یہ فیصلہ کا دن ہوگا۔ ہمارے درمیان اور اس دن کے درمیان صرف موت کا فاصلہ ہے۔ وہ موت جس کے تسلق کسی کو نہیں معلوم کہ وہ کب آجائے گی۔ آج جو لحظات ہم گزار رہے ہیں اس کے ہر لمحہ کا انجام ہم کو آئندہ کروڑوں سال تک بھگتنا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص ایک ایسے انجام کی طرف چلا جا رہا ہے جہاں اس کے لیے یا تو دائمی عیش ہے یا دائمی عذاب۔ زندگی کی مثال ایک جو ڈھلوان کی ہے جس پر سارے انسان نہایت تیزی کے ساتھ بھاگتے چلے جا رہے ہیں۔ ہر لمحہ جو گزرتا ہے وہ ہم کو اس آخری انجام سے قریب تر کر دیتا ہے جو ہم میں سے ہر ایک کے لیے مقرر ہے۔

ہم کو زندگی کے صرف چند دن حاصل ہیں۔ ایسے چند دن جن کا انجام کروڑوں اور اربوں سال نہیں بلکہ ابدالاً ماد تک بھگتنا پڑے گا۔ جس کا امام بے حد خوش گوار ہے اور جس کی تکلیف بے حد دردناک۔ ہر بار جب سورج غروب ہوتا ہے تو وہ آپ کی عمر میں ایک دن اور کم کر دیتا ہے۔ اس عمر میں جس کے سوا آنے والے ہولناک دن کی تیاری کا اور کوئی موقع نہیں۔ ہماری زندگی کی مثال برف بیچنے والے دوکان دار کی ہے، جس کا آثار ہر ٹوکھل کر کم ہوتا جا رہا ہو اور جس کی کامیابی کی شکل صرف یہ ہو کہ وہ وقت گزرنے سے پہلے اپنا سامان بیچ ڈالے ورنہ آخر میں اس کے پاس کچھ بھی نہ ہو گا اور دوکان سے اس کو خالی ہاتھ اٹھ کر جانا پڑے گا۔ پھر قبل اس کے کہ موت آکر ہم کو اس دنیا سے جدا کر دے، جہاں صرف کرنا ہے اور اس دنیا میں پہنچا دے جہاں کرنا نہیں بلکہ صرف پانا ہے، ہمارے لیے ضروری ہے کہ اپنی قولوں اور صلاحیتوں کا صحیح مصرف سوچ لیں۔ ہم سب کو ایک روز مالک کائنات کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ پھر خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اپنے رب کے پاس اس حال میں پہنچیں کہ دنیا میں وہ حق کے لیے اپنا سب کچھ لٹا بیچے تھے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سب سے پہلے انھیں پر نظر کرے گا۔

رتقریر اجتماع جماعت اسلامی ہند بمقام کھنؤ، یکم مارچ ۱۹۵۸ء

## قرآن کا مطلوب انسان

ایک حدیث ہے کہ — **الْمُؤْمِنُ، مِرَاةُ الْمُؤْمِنِ** — یعنی مومن دوسرے مومن کے لیے آئینہ بنتا ہے۔ آج کی جہمت میں آپ کے لیے میں بھی بننا چاہتا ہوں۔ اس موقع پر بہترین خدمت جو میری سمجھ میں آئی ہے وہ یہ کہ میں نہایت سادہ اور مختصر طور پر چند ایسی باتیں آپ کے سامنے رکھوں جس میں آپ خود کو بالکل برہنہ دیکھ سکیں۔ اللہ میری اور آپ کی مدد فرمائے۔

ایمان کی علامت کیا ہے۔ اس کی اگر مختصر ترین فہرست بنائی جائے تو شاید وہ دو چیزوں پر مشتمل ہوگی۔ قرآن اور نماز۔ یہ دو الفاظ دراصل پورے دین کا عنوان ہیں۔ ایک نظری حیثیت سے سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور دوسرا عملی پہلو سے۔ اسی نے دراصل خدا کو پایا ہے جس نے قرآن اور نماز کو پایا ہے۔ یہ دونوں چیزیں اگر آپ کی زندگی میں شامل ہوگی ہوں تو سمجھیے کہ ایمان اور اسلام آپ کی زندگی میں شامل ہو گیا ہے اور اگر آپ کی زندگی ان سے خالی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ ابھی تک ایمان اور اسلام سے محروم ہیں۔

ان دونوں چیزوں کی بنیادی اہمیت خود قرآن سے ثابت ہے، جیسا کہ فرمایا:

**وَالَّذِينَ نَسُوا آيَاتِ اللَّهِ وَقَاتِلُوا الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْبَنِينَ وَالنَّسَاءَ وَالْمَالِ وَالْأَنْفُسَ فَهُمْ جَنَّةٌ كَثِيرَةً يَدْخُلُونَهَا لَمْ يَكُنْ لَهُمْ فِيهَا حِسَابٌ** (اعراف - ۱۷۰)

جو لوگ خدا کی کتاب کو مضبوط پکڑتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں، ہم ایسے مصلحین کا اجر و ثواب نہیں کریں گے۔ جو پہلے صرف دوسرے جو قرآن اور نماز کو اپنی زندگی میں شامل کر چکا ہو۔ اسے ہی لوگوں کی کوشش خدا کی نظر میں اصلاح کی حیثیت رکھتی ہیں اور انھیں کے عمل کو اللہ تعالیٰ دنیا میں برآمد کرے گا اور آخرت میں اپنے انعام سے سرفراز فرمائے گا۔ دوسرے مقام پر یہی چیز حکم کے انداز میں کہی گئی ہے۔

**أَتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيَّ مِنَ الْكِتَابِ وَأُقِيمُ الصَّلَاةَ وَأَنْتَ عَلَيَّ بِرَبِّي وَأَنَا عِنْدَ رَبِّي عَلَى الصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ وَالرِّزْقِ الْمَعْتَدِ** (عنکبوت - ۲۵)

مگر قرآن اور نماز کو پانے کا مطلب کسی لفظی مجبورے یا کسی ظاہری ڈھانچے کو پالنا نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ایک عظیم حقیقت کو پانا ہے جو آدمی کے وجود پر چھپا جاتی ہے، جو اس کی پوری زندگی بن جاتی ہے اصل یہ ہے کہ ہر چیز جو آپ کی زندگی میں نظر آ رہی ہو اس کی دوسو مرتب ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ اس کو آپ نے تحقیقی طور پر اختیار کیا ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ آپ کی زندگی کا حقیقی جزو نہ ہو بلکہ کچھ دوسرے اسباب کے تحت وہ آپ کے اثبات البیت میں شامل ہوگئی ہو۔ یعنی مکن ہے کہ آدمی الفاظ کے ذریعے اپنے بارے میں جو دعویٰ کرنے اس کا بطن القول اس کے خلاف گواہی دے رہا ہو (مرد - ۲۰) اس کی زبان و قلم سے نہایت اعلیٰ درجے کی باتیں نکل رہی ہوں مگر اس کا یہ تمام عمل **يَقُولُونَ بِلَا حُورٍ مَّحْجُومٍ مَا كُنْ فِي تَسْلُوبٍ فَعِم** (آل عمران - ۱۶۶) کا مصداق ہو جاتا کی زندگی کا مرکز و محور اس کے معاشی مفادات اس کی بیوی بچے اور اس کی دنیوی تناسی ہوں مگر گنگتکو اور تعلقات

میں وہ اپنے آپ کو اس طرح ظاہر کرے گا یا اس نے خدا اور اس کے دین کو اپنی زندگی کا مرکز و محور بنا رکھا ہے۔

شمال کے طور پر ایک شخص امت کی حالت ناز پر تقریریں اور بیانات شائع کر رہا ہو مگر اس کی زندگی میں ایک رات بھی ایسی نگزری جو جب کہ امت کے درد میں اس کی خینداڑ جانیے اور جہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اس کی زبان سے نکلے کہ۔ "خدا یا تو انھیں ہدایت دے، خدا یا مجھے طاقت دے کہ میں ان کو تیرے راستے کی طرف بلا سکوں۔ تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ امت کے درد سے زیادہ اس کو خدا پناہ درد سنا رہا ہے۔ کیونکہ اس عنوان کو اختیار کیے بغیر وہ پریس اور ریڈیو کے اپنے آپ کو نمایاں نہیں کر سکتا۔ مزے کے گرد بات چیت میں اگر کوئی شخص مظلوم انسانوں کی حمایت پر گرم گرم صدر لے رہا ہو مگر اس کی روزمرہ کی زندگی مظلوم انسانوں کی ہمدردی سے خالی ہو تو یہ ہمدردی کا نہیں بلکہ ریا کاری کا ثبوت ہے۔ رسی قسم کے بحث و مباحثہ میں اگر کوئی شخص اصول اور ضابطے کا بہت حوالہ دیا ہو، مگر اس گفتگو کے باہر جو زندگی وہ گزارتا ہے وہ بے اصولی کا نمونہ ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ حقیقتاً اس کے اندر موجود نہیں ہے اس کو وہ الفاظ کے ذریعہ اپنے اندر ثابت کرنا چاہتا ہے وہ اپنے آپ کو ایک ایسی حیثیت میں ظاہر کر رہا ہے جو کہ دراصل اس کی حیثیت نہیں ہے۔ اگر آپ کسی کو دیکھیں کہ دوسروں پر تنقید کرنے میں اس کی زبان بہت تیز ہے مگر خود اس کو عمل کے جو مواقع حاصل ہیں ان میں وہ خود بھی اسی قسم کی کمزوریاں ظاہر کر رہا ہے جس میں دوسرے لوگ اپنے دائرے کے اندر مبتلا ہیں تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کو فی الواقع اصلاحی حالت سے کوئی ڈبچا نہیں ہے۔ اس کو صرف تنقید عزیز ہے اور اسی کو وہ انجام دے رہا ہے۔

کئی سال پہلے کی بات ہے۔ میں ایک مرتبہ ٹراونکوور کے علاقے میں ٹرین سے سفر کر رہا تھا۔ میرے سامنے کی سیٹ پر کچھ عیسائی بیٹھے ہوئے آہیں میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک نے کہا۔ مسلمانوں کے اندر مذہبی اسپرٹ بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ان کا ہر کچھ جب تعلیم شروع کرتا ہے تو سب سے پہلے اس کو قرآن پڑھایا جاتا ہے۔ بینک یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے۔ بلکہ مسلمانوں میں تو یہ روایت رہی ہے کہ وہ روزانہ صبح کی نماز کے بعد سب سے پہلے کتاب الہی کی تلاوت کرتے ہیں۔ اگرچہ موجودہ زمانے کی سطحیت پسندی نے اس ذوق کو بڑا نقصان پہنچایا ہے اور خاص طور پر پڑھے لکھے لوگوں کی صبح تو اب تلاوت قرآن کے بجائے تلاوت اخبار میں بسر ہونے لگی ہے۔ تاہم اب بھی ہمارے یہاں ایسے مردوں اور عورتوں کی کافی تعداد ہے جو کسی ذہنی حد تک اس روایت کو باقی رکھے ہوئے ہیں۔ مجھے اس سے اکاؤ نہیں کہ اس قسم کی تلاوت بھی ایک دینی کام ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کو جو چیز مطلوب ہے وہ محض الفاظ قرآن کی تلاوت نہیں بلکہ تلاوت حق بنے جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:-

الَّذِينَ آمَنُوا هُمْ أَكْبَرُ حَقُّ تِلَاوَتِهِ ۗ  
 هُوَ الَّذِي يُعَلِّمُ الْوَسْطَانَ حَقًّا تِلَاوَتِهِ ۗ  
 الَّذِينَ آمَنُوا هُمْ أَكْبَرُ حَقُّ تِلَاوَتِهِ ۗ  
 هُوَ الَّذِي يُعَلِّمُ الْوَسْطَانَ حَقًّا تِلَاوَتِهِ ۗ

یہ تبادلت تھی جس کو حامل ہوگئی ہو وہی دراصل قرآن کا قاری ہے اور وہی اس پر صحیح معنوں میں ایمان لانے والا ہے۔ تلاوت حق کی پہچان کیا ہے۔ اس پر جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمارے سامنے سب سے پہلے یہ آیت آتی ہے۔

وَإِذْ آمَأْنَا نَزَّلَتْ سُورَةٌ فَخَسِبْنَا مَنْ لَقِيَ لَوْلَا  
 أَيْتُكُمْ زَادَتْهُ هُدًى وَآمِنَانًا فَآمَنَّا الَّذِينَ  
 آمَنُوا فَزَادَتْهُمْ أٰمِنَانًا وَهُمْ يَلْبِسُونَ ٥ (توبہ ۱۲۴)

اور جب کوئی سورہ اترتی ہے تو بعض منافقین کہتے ہیں کہ اس سورہ نے تم میں سے کس کا ایمان بڑھا دیا ہے۔ ہاں اس نے ان لوگوں کا ایمان بڑھا دیا ہے جو واقعی مومن ہیں اور وہ اس کو پاکر خوش ہیں۔

اس آیت سے قرآن پر ایمان رکھنے والوں کی پہچان یہ معلوم ہوتی کہ وہ جب قرآن کو پڑھیں تو اس سے ان کے ایمان میں اضافہ ہو۔ وہ اپنے بہترین احساسات کو اس کے اندر بولتا ہوا پائیں۔ یہی وہ چیز ہے جس کو دوسرے مقام پر قرآن حق کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، فرمایا:-

وَإِذْ سَمِعُوا مَا نَزَّلَ ابْنُ الْمَرْسُولِ تَرَىٰ اٰمِنَتُهُمْ  
 تَفِيضًا مِّنَ الْمَرْسُوعِ مِمَّا عَرَفُوْهُمِنْ الْحَقِّ ۝۸۳

اور جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو خدا کے رسول پر اترا ہے تو تم دیکھو کہ ان کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں، ان کے سب سے

اضافہ ایمان اور عرفان حق دونوں ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں۔ جو لوگ قرآن کے واقعی مومن ہیں وہ جب قرآن کو پڑھتے ہیں تو یہ کتاب انہیں سرراہ حقیقت نظر آتی ہے، وہ حقیقت جس کے متعلق علم انسانی نے تسلیم کیا ہے کہ وہ بھی اسے معلوم نہیں کر سکتا۔ وہ حقیقت جس کو فلسفہ ہزاروں سال سے تلاش کر رہا ہے مگر وہ اس تک پہنچ نہ سکا، اہل ایمان اس کو خدا کی کتاب میں پالیتے ہیں۔ قرآن کی شکل میں وہ حقیقت کو دیکھنے لگے ہیں۔ یہ علم ان کے عقین کو بڑھاتا ہے، قرآن کے مضامین اپنے پڑھنے والے سے جس قسم کی جوابی کیفیات کا تقاضا کرتے ہیں ان کا دل ہر مقام پر بالکل اس کے مطابق ڈھلتا چلا جاتا ہے۔ جب زمین و آسمان کی نشانیوں پیش کر کے اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے کہ ان کا خالق کون ہے تو بے اختیار ان کی زبان سے نکل پڑتا ہے: "بل انت یا رب" جب خدا کے احکام ایمان ہوتے ہیں اور انسان سے اس کی حقیقت کے مطابق صحیح رویے کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو وہ پکاراٹختے ہیں رَبَّنَا اٰمِنًا فَخَبَرْنَا نَحْنُ السَّاهِدِيْنَ۔ قرآن کو پڑھتے ہوئے دل کا اندر یہ عقین ابھرنا چاہیے کہ یہ خدا کا کلام ہے، جس مطالعہ سے یہ کیفیت حاصل نہ ہو وہ اندر سے بہرے کا مطالعہ ہے۔ (رفقان) مومن جب قرآن کو پڑھتا ہے تو اس کو اس طرح پڑھتا ہے گویا وہ رب العالمین کی آواز سن رہا ہے، گویا وہ خدا سے ہم کلام ہے، گویا خدا نے خود اس کے اوپر نازل ہو رہا ہے۔ قرآن اس کی سب سے محبوب کتاب بن جاتی ہے جس میں وہ اپنے جذبات کی تکلیف پاتا ہے، جس سے وہ اپنے دل کی دنیا کو آباد کرتا ہے، جس سے اس کو ایک نئی روشنی حاصل ہوتی ہے جو اس کے تمام عقل اور روحانی تقاضوں کا جواب بن جاتی ہے۔

قرآن کا یہ پانہض ایک علمی دریافت کی قسم کی چیز نہیں ہے بلکہ یہ بندے کا اپنے رب کو پانا کلمہ اس تک

ہنچ جانا ہے۔ تاریخ میں اس کی مثالیں موجود ہیں کہ بعض لوگوں کے علمی ذوق نے انہیں کتابوں کا حائق بنا دیا ہے۔  
 کی بھی بہت سی مثالیں ملیں گی کہ کسی فلسفی یا مفکر کی تصنیفات نے لوگوں کو اتنا متاثر کیا کہ وہ بالکل اس کے دوس  
 ہو گئے۔ محقر ذرا کی کتاب کا ماحول اس قسم کے واقعات سے بالکل مختلف ہے۔ یہ کائنات کے خالق و مالک کی کتاب  
 ہے اور ہم اس کے حقیر نمبر سے ہیں۔ اس نسبت کا قدرتی تقاضا ہے کہ قرآن سے ہمارا تعلق محض علمی تعلق نہ ہو بلکہ وہ  
 نمبر سے اور خدا کا تعلق بن جائے۔ ہم جب قرآن کو پڑھیں تو ہمارے اوپر وہ ہیبت طاری ہو جو کائنات کے  
 فرمانروا کا حکم سن کر اس کے ایک عاجز غلام پر طاری ہونی چاہیے۔ اس کو پڑھتے ہوئے ہمارا دل پھیل جائے،  
 ہماری آواز پست ہو جائے، ہمارا پورا وجود سرسبز یا عجز و نیاز بن کر اس کے آگے جھک جائے، جیسا کہ ارشاد  
 ہوا ہے۔

اللّٰهُ الَّذِي نَزَّلَ الْحَدِيثَ كِتَابًا  
 مُّتَشَابِهًا مَّثَانًا تَفْصِيحًا مِنْهُ حُلُوبًا وَالَّذِي يُن  
 بَخِشُونَ رَبَّهُمْ نَسْمًا تَلِينًا جُلُوبًا دُمُومًا وَسَاءَ  
 لِي لِحَاكِمِهِ (زمر - ۲۳)

وہ اللہ ہے جس نے یہ بہترین کتاب آماری ہے جس کی  
 باتیں آپس میں ملتی ہوئی دہرائی ہوئی ہیں، اس کو سن  
 کر ان لوگوں کے بدن کا پٹ اٹھتے ہیں جو خدا سے ڈرنے والے  
 ہیں پھر ان کے دل اور ان کے جسم خدا کی یاد کی لہر جھک جاتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن خدا سے ڈرنے والوں کے لیے پکھی پیدا کرنے والی کتاب ہے، اس کو سن  
 کر ان کے بدن کے رنگتے کھڑے ہو جاتے ہیں، وہ انہیں خدا کی طرف مائل کرتی ہے، وہ انہیں ذکر الہی میں فروغ  
 کر دیتی ہے، وہ جب اسے سنتے ہیں تو ان کے قلوب گھل کر آنکھوں کے راستے سے بہنے لگتے ہیں۔ قرآن کو سننے یا پڑھنے  
 کے وقت دل کے اندر خدا کی یاد اور شعور پیدا ہونا چاہیے، ایسا نہ ہو تو اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی قادت  
 قلب، کی بیماری میں مبتلا ہو چکا ہے۔ (حلیہ - ۱۶)

یاد رکھیے قرآن سے نا آشنا صرف وہ لوگ نہیں ہیں جن کے لیے یہ کتاب، کتاب مہجور بن گئی ہے جنہوں  
 نے قرآن کو اس طرح پس پشت ڈال دیا ہے گویا کہ وہ اسے جانتے ہی نہیں گویا ان کی زندگی سے اس کا کوئی  
 تعلق نہیں ہے، بلکہ وہ شخص بھی قرآن سے محروم ہے جس کے لیے یہ کتاب صرف خوش الحانی کے لیے موزوں الفاظ  
 مہیا کرتی ہو، جس کے لیے وہ محض علمی غور و بحث کا موضوع ہو، جس کے لیے وہ حوالے کی کتاب ہو جس کو وہ تحریر و  
 تقریر کے وقت الٹ پلٹ کر دیکھ لیتا ہو۔ یہ عین ممکن ہے کہ ایک شخص نے ہزاروں انسانوں کے درمیان  
 صرف قرآن کی بنیاد پر اپنی شخصیت کا سکہ بٹھا رکھا ہو، مگر وہ قرآن کی نسبت سے محروم ہو۔ اسی طرح اگر آدمی زبان  
 قلم کے ذریعے قرآن کے اسرار و معارف بیان کر رہا ہو مگر اس کی اپنی زندگی ان حقیقتوں سے خالی ہو تو یہ بھی خدا  
 کی کتاب سے محرومی کی ایک قسم ہے۔ دوسروں کو کتاب الہی کا درس دینا اور خود "نسیان" میں مبتلا رہنا، قرآن  
 سے تعلق نہیں بلکہ بے تعلقی کا ثبوت ہے (بقیہ - ۲۴) اگر کسی نے لغت اور نحو کی مدد سے الفاظ قرآن کو حاصل  
 کر لیا ہو تو اس کے سنی یہ نہیں ہیں کہ وہ قرآن کو بھی پا گیا ہے۔ قرآن کو پانے والا صرف وہ شخص ہے جس نے

اپنے سینے کی دھڑکنوں میں اس کو بوتے ہوئے سنا ہے، جس نے ان حقیقتوں کو اپنی آنکھ سے دیکھا ہے جس کا قرآن میں ذکر ہے جس نے اس کو اس طرح پڑھا ہے گویا وہ خود اپنے اندر چھپے ہوئے میٹھے کو زبان سے دہرا رہا ہے۔ یاد رکھیے حقیقت کو پانے والا صرف وہ ہے جس نے اپنے دل کی کتاب پر اس کو لکھا ہوا پایا ہے جس نے صرف لفظی تشریحات کے ذریعہ اسے جانا ہے، اس نے حقیقت کو ابھی تک پایا ہی نہیں:

سَبَّحُ هَذَا أَيُّهَا تَبَيَّنَاتٌ فِي حُصَّةٍ ذُو الدِّينِ  
 قرآن کیا ہے وہ کھلی ہوئی آیتیں ہیں جو ان لوگوں  
 کے سینوں میں ہیں جو معرفت رکھتے ہیں۔  
 (عنکبوت - ۴۹)

قرآن کی جو صفیٰ بیان کی گئی ہیں وہ اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ صفیٰ بتاتی ہیں کہ قرآن کے وہ کیا پہلو ہیں جن کا ہماری زندگیوں میں شامل ہو جانا ہمارا خدا کی کتاب کو پالنا ہے۔ قرآن کو پانے والا وہ ہے جس کی مردہ روح کو قرآن سے زندگی ملی ہو جس کے لیے وہ دل کے رنگ کو دودھ کرنے والی کتاب ہو جس کے لیے وہ نور بن گیا ہو جس کی روشنی میں وہ چلتا ہو۔ قرآن کو ان لوگوں نے پایا ہے جن کا حال یہ ہے کہ جب وہ اسے پڑھتے ہیں تو ان کے دل دہل اٹھتے ہیں اور وہ اپنے آنسوؤں سے اس کا استقبال کرتے ہیں۔ ان کی شخصیت صاحب قرآن کے آگے سجود ریز ہو جاتی ہے۔ یہی وہ علامات ہیں جو بتاتی ہیں کہ آدمی کو قرآن کی تلاوت حق نصیب ہوئی ہے یا نہیں اور اس نے فی الواقع خدا کی کتاب کو پالیا ہے یا وہ ابھی تک اس سے محروم ہے۔

إِذْ أُنزِلَتْ عَلَيْهِمُ آيَاتُ الرَّحْمَنِ خَرُّوا سُجَّدًا  
 جب اللہ کی آیتیں انہیں سنائی جاتی ہیں تو وہ روئے  
 ہوئے سجدے میں گر پڑتے ہیں۔  
 (مریم - ۵۸)

یہاں ایک بات ابھی طرح سمجھ لینی چاہیے۔ یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی نام چیزوں کو اس ڈھنگ پر بنایا گیا ہے کہ ایک ہی چیز سے آدمی بھیت بھی حاصل کر سکتا ہے اور وہی بیک وقت اس کے لیے فتنے میں پڑنے کا بھی ذریعہ ہے۔ ٹھیک یہی حال خدا کی کتاب کا بھی ہے، جیسا کہ فرمایا:

كَذَّبُوا اللَّهَ لِيُفِرَّخَ اللَّهُ مِنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي  
 اسی طرح اللہ قرآن کی آیتوں سے کسی کو گمراہ کرتا ہے اور  
 مَنْ يَكْفُرْ  
 کسی کو ہدایت دیتا ہے۔  
 (مدثر - ۱۳۱)

بلاشبہ قرآن کتاب ہدایت ہے۔ مگر آدمی کا اپنا چہرہ جتنا صاف ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ آنیہ کے اندر صاف دکھائی دے گا۔ چنانچہ قرآن سے بھی آدمی کو وہی کچھ ملتا ہے جو وہ اس سے حاصل کرنا چاہتا ہو۔

قرآن کے ذریعہ بے راہ ہونے کی ایک صورت تو وہ ہے جب کہ آدمی اس میں سے ایسی باتیں ڈھونڈ لے جو اس کے لیے قرآن پر ایمان نہ لانے کا بہانہ بن جائیں۔ مگر جو لوگ قرآن کو مانتے ہیں وہ بھی اس خطرہ سے محفوظ نہیں ہیں۔ اس قسم کی ممکن صورتوں میں سے ایک وہ ہے جس کا عنوان تحریف ہے۔ یعنی سب کچھ جاننے کے باوجود محض اپنی عقلی کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کلام الہی کے الفاظ یا اس کے معانی کو بدل دینا (بقرہ - ۱۷۵)

دوسری چیز اقسام ہے۔ عجم۔ ۹۰ اقسام کے معنی ہیں یا مثلاً، تعیرم کرنا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ خدائی تعلیمات کو پوری شکل میں قبول نہ کیا جائے بلکہ اپنی خواہش کے مطابق ٹکڑے کر کے اس کے بعض حصوں کو لیا جائے اور بعض کو چھوڑ دیا جائے۔ تیسری چیز وہ ہے جس کو قرآن میں مضامین کہا گیا ہے (توبہ۔ ۳۰) مضامین کے معنی عربی زبان میں مشاکلتہ الٹھی یا الٹھی کے آتے ہیں (اسان العرب الٹھی کسی چیز کو دوسری چیز کے ہم شکل قرار دینا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل باطل کے خیالات سے متاثر ہو کر یا دنیوی مصالح کی بنا پر ان کی بات کو اپنالیا جائے اور اس کو اس طرح پیش کیا جائے گویا وہ خدائی تعلیم کے عین مطابق یا اس کے مشابہ ہے۔

جہاں تک پہلی صورت (تخریف) کا تعلق ہے اس کی بنیاد مکمل طور پر بدینتی کے اوپر قائم ہے۔ اور ہم سب لوگ اس کی برائی سے اچھی طرح واقف ہیں۔ مگر دوسری اور تیسری صورت کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ یہ نینتہ کبھی کبھی اچھے خاصے نیک نیت لوگوں میں بھی اس طرح چپکے سے داخل ہو جاتا ہے کہ انھیں خبر نہیں ہوتی اور وہ اپنا کام تمام کر کے بالآخر انھیں کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے۔

ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ انسان اکثر حالات میں متاثر ذہن کے ساتھ واقعات کا مطالعہ کرتا ہے۔ وقت کی سوسائٹی میں جن خیالات کی اہمیت تسلیم کی جا چکی ہوتی ہے۔ قدرتی طور پر وہ ان کا اثر قبول کرتا ہے۔ اسی طرح حقیقی دنیا کی سب سے مصلحتیں معصوم شکل میں آکر اس کے ذہن کی سطح سے باہر نکل جاتی رہتی ہیں۔ یہ چیزیں مل کر کبھی شعوری اور زیادہ تر غیر شعوری طور پر اس کا ایک ٹکڑا بناتی ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان ہمیشہ چیزوں کو صرف اس حقیقت سے نہیں دیکھتا جیسی کہ وہ فی الواقع ہیں۔ اکثر حالات میں وہ مجبور ہوتا ہے کہ چیزوں کو اس حقیقت سے دیکھے جیسا کہ اس کا ذہن انھیں دیکھنا چاہتا ہے۔ اس طرح جب کوئی شخص ایک خاص ذہن لے کر قرآن کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ بلا ارادہ اقسام کی ایک صورت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ قرآن کی بعض ایسی باتوں کو تو لے لیتا ہے جو اس کے ذہن کے چوکھٹے میں بیٹھ سکتی ہوں اور باقی تمام باتوں کو چھوڑتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح وہ سارا قرآن پڑھ لیتا ہے اور کھتا ہے کہ اس نے خدائی کتاب کو پالیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ قرآن سے باطل بے خبر رہتا ہے۔ اس نے خدائی کتاب کے بڑے حصے کو چھوڑ کر اس کے بعض اجزاء کو اپنے خود ساختہ مفہوم میں لے لیا ہے۔ اس نے جو چیز پائی ہے وہ وہی ہے جو اس کے ذہن میں پہلے سے موجود تھی اور جس کی تائیدیں اتفاق سے قرآن کی بعض آیتیں بھی اسے ہاتھ آئیں۔ ایسے آدمی کی مثال اس تعلیم یافتہ نوجوان کی ہے جو اپنی بے کاری سے پریشان ہو اور صرف "ضرورت ملازمت" کے انتہا ہارت دیکھنے کے لیے اخبار کا مطالعہ کرتا ہو۔ یہ نوجوان اپنے اس مطالعہ سے ممکن ہے ملازمت کی درخواست بھیجے کے لیے کچھ پتے حاصل کر لے مگر وہ دنیا کی سیاست سے بے خبر رہے گا اور اخبار دہنی کے اہل مقصد کو حاصل نہ کرے گا۔

اسی طرح مضامین کی خرابی بھی آدمی کے اندر خاموشی کے ساتھ داخل ہو جاتی ہے۔ اس میں ماحول کے ذہنی تاثر کے علاوہ خاص طور پر ذہنی ضروریات کا بھی کچھ دخل ہوتا ہے۔ یہ خیال کہ حیات لوگوں سے کہنی ہے وہ اسی

ہونی چاہیے جو لوگوں کے ذہن سے قریب تر ہو تاکہ وہ اس کو قبول کر سکیں۔ نیز یہ کہ بات کو ایسے الفاظ اور اصطلاحات میں پیش کیا جائے کہ وقت کا معیار فکر اس کی اہمیت تسلیم کرنے پر مجبور ہو، وقت کے علمی خیالات کے ساتھ وہ پورے طور پر جگمگے سکے۔ یہ اگرچہ بذات خود غلط نہیں ہے مگر بعض مرتبہ وہ آدمی کے ذہن میں خدائی تعلیمات کی ایسی تصویر بناتا ہے جو اصل تعلیمات سے زیادہ وقت کے نظریات سے مطابقت رکھنے والا ہو۔ خدائی تعلیمات سے جزدی مشابہت تو ضرور اس میں موجود رہتی ہے۔ مگر درحقیقت وہ اسلامی الفاظ اور اصطلاحات میں غیر اسلامی خیالات کی ترجمانی ہوتی ہے۔

اگر بے جا جہارت نہ ہو تو میں عرض کروں گا کہ نقیض جو ایک دماغ کے مطابق یونانی لفظ تھیوسوفیا (Theosofia) کی تعریف ہے، وہ بھی اسی نوعیت کا ایک واقعہ ہے جو دوسری صدی ہجری کے نصف آخر میں بعض خارجی اثرات کے تحت اسلام کے اندر داخل ہو گیا۔ ہمارے قدیم بزرگ جب اسلام کا پیغام لے کر عرب کے باہر دوسرے ملکوں میں گئے تو انہوں نے اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پایا جہاں کچھ مخصوص انکار و انشمال لوگوں کے ذہنوں پر چھائے ہوئے تھے اور مذہب اور مذہبی زندگی کا تصور ان کے لہجہ نہیں کیا جاسکتا تھا یہی نہیں بلکہ انی انکار و انشمال کی لہجہ پر ایک زبردست فلسفہ بھی موجود تھا۔ ان چیزوں نے کچھ دعوتی مصلحت اور کچھ انفعالی تصور کے تحت ہمارے بزرگوں کو آمادہ کیا کہ وہ اسلام کو اس رنگ میں پیش کریں جس سے لوگ پہلے سے ناخوش ہیں۔ اس طرح نبوت کے تقریباً دو سو سال بعد اسلام کی متصوفانہ تعبیر ہماری تاریخ میں داخل ہو گئی۔

اب قدیم روحانی انداز میں سوچنے کا زمانہ ختم ہو رہا ہے اور ہم ایک ایسی دنیا میں سانس لے رہے ہیں جہاں کہ ہر طرف معاشی اور سیاسی تحریکوں کا زور ہے۔ آج کا انسان عام طور پر اس انداز میں سوچتا ہے کہ موجودہ سماجی ڈھانچے کو بدل کر کسی اور بنیاد پر دنیا کا نظام چلایا جائے۔ یہ اسی قسم کا ایک نیا فتنہ ہے جس سے ہمارے پیش روؤں کو سابقہ پیش آ یا تھا۔ وہ اگر تعبیر روحانیت کا فتنہ تھا تو یہ تعبیر مادیت کا فتنہ ہے۔ اب اگر ہم نے اس فتنے کو نہ پہچانا اور اس سے اپنے ذہن کو محفوظ رکھنے کی کوشش نہ کی تو ہم بھی دین کی تعبیر میں اسی قسم کی غلطی کریں گے جو اس سے پہلے صوفیائے کرام سے ہو چکی ہے۔ اور پھر قرآن کی ایک نئی تفسیر کر کے قدیم روحانی تصوف کی طرح اسلام کو ایک جدید سیاسی تصوف بنا کر رکھ دیں گے۔ اور اس کے بعد ان تمام نتائج سے دوچار ہوں گے جو سیاسی تحریکوں کے لیے مقدر ہیں۔

۱) تصوف کی اصل کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ دوسری زیادہ مقبول رائے یہ ہے کہ یہ لفظ صوف (ادن) سے بنا ہے۔ ابتدائی زمانہ میں اس طبقہ کے لوگ اکثر ادن کا معنی لباس پہننے تھے اس لئے ایسے لوگوں کو صوفی اور ان کے طریقہ کو تصوف کہا جانے لگا۔

## ناز

اب ناز کو بھی۔ ناز دین کا بنیادی ستون ہے۔ اس کے بغیر کسی کا ایمان ہی معتبر نہیں۔ وہ آدمی کے لیے نجات کا ذریعہ ہے۔ (حدیث) مگر یہ فائدہ صرف اس نماز سے حاصل ہوتا ہے جو صلوٰۃ ختوع ہو، جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۗ اَلَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝ (مومنون - ۱۲)

کامیاب ہوئے ایمان لانے والے، وہ جو اپنی نماز میں ختوع خاشعاً کرتے ہیں۔

میں سب سے خیر چیزوں کا ذکر کروں گا جس سے معلوم ہوگا کہ صلوٰۃ ختوع کیا ہوتی ہے اور اس کی علامات کیا ہیں۔

پہلی بات یہ کہ اس سے مراد وہ ناز ہے جو اس طرح پڑھی جائے کہ آدمی اس کا لگلاں اور محافظ بن گیا ہو:

حَافِظٌ عَلَى الصَّلَاةِ (رقبہ - ۲۳۸) اپنی نمازوں کی حفاظت کر۔

یہاں حفاظت سے مراد یہ ہے کہ آدمی اپنی روزانہ زندگی کو ہر اس چیز سے بچائے جو اس کی نماز میں خلل ڈالنے والی ہو جس سے وہ اپنی نمازوں کو ٹھیک ٹھیک ادا کر سکے، اس میں وقت کا اہتمام خاص طور پر درپیش ہے۔ محافظت صلوٰۃ اپنے اظہار کے لحاظ سے، محافظت اوقات کا دوسرا نام ہے۔ نماز اہل ایمان کے لیے، کتاب و سنت ہے جس کو ستین لمحات میں رکوع کرنے والوں کے ساتھ باجماعت ادا کرنا ہے۔ اس لیے آدمی کو ہر اس عادت یا ہر اس مشغولیت سے اپنی زندگی کو بچانا اور پاک کرنا ہے جو اس کو وقت پر نماز باجماعت کی ادائیگی سے محروم کر دے یا بگیرہ تحریر کے وقت وہ مسجد کی صف میں کھڑا ہوا نظر آئے۔

ٹھیک وقت پر ناز کے لیے حاضر ہونا محض فوجی ڈپلن کی تم کی چیز نہیں ہے بلکہ وہ دراصل بندے کی طرف سے اس بات کا مظاہرہ ہے کہ وہ آقا کی پکار پر فوراً دوڑ پڑنے کے لیے تیار ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب خدا کے گھر سے، آؤ نماز کی طرف، کی آوازیں بلند ہوتی ہیں تو خدا کا بندہ ہر دوسری مشغولیت سے اپنے آپ کو فارغ کر کے خدا کی پکار کی طرف دوڑ پڑتا ہے۔ یہ انتہائی آماجگی اور انتہائی تعلق کا ثبوت ہے۔ وقت آنے ہی نماز کے لیے دوڑ پڑنا اس بات کا اظہار ہے کہ آدمی نے اپنی زندگی میں اولین مقام صرف خدا کو دے رکھا ہے، مگر جو شخص ایسا نہیں کرتا وہ گویا اس بات کا مظاہرہ کرتا ہے کہ خدا کے سوا دوسری چیزوں کو بھی وہ اپنی عبادت میں شریک کیے ہوئے ہے۔ وہ یا تو بے سعی کا شکار ہے یا کسی دوسری مشغولیت کو اس نے اپنی زندگی میں وہ مقام دے رکھا ہے جو دراصل خدا کا ہونا چاہیے۔

مسجدوں کی صف بندی دراصل خدا کے دربار میں کھڑے ہونے کا وقت ہے۔ جو اس اہم ترین وقت پر خدا کے گھر میں نظر نہ آئے یا دیر سے پہنچے وہ گویا اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ اس کو خدا کی پکار سے زیادہ اپنے نفس کی پکار عزیز ہے، عین اس وقت بھی وہ اپنے آپ کو دوسرے مشاغل میں مصروف رکھتا ہے جب خدا کے بندے خدا کے حضور کھڑے ہو رہے ہوتے ہیں۔ ایسے آدمی کے متعلق یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ خدا کی یاد سے غافل ہے۔

ایک امام واقعہ ہے۔ ان کی مسجد کے نازی عموماً دیر کر کے نماز کے لیے آتے تھے۔ ایک روز نماز شروع ہوئی تو حسب دستور دیکھے چند آدمی موجود تھے، اور جب امام نے سلام پھیرا تو پوری صف کھڑی ہوئی ننگرائی۔ یہ نظر دیکھ کر بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا۔ "کاش اللہ تعالیٰ مجھے منقیوں کا امام بنا سکتے۔ ایسے لوگوں کی امامت نے تو مجھے بیار بنا دیا جن کا حال یہ ہے کہ جب نماز شروع ہو جاتی ہے یا اس کا ایک حصہ گزر جاتا ہے تو وہ بھاگ بھاگ آتے ہیں اور دائیں بائیں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بخدا یہ وہ نماز نہیں ہے جو اللہ اور اس کے رسول کو مطلوب ہے۔ یہ کس کے ساتھ خدا کی عبادت کے لیے اٹھنا ہے جس کو ذکر قلیل کہا گیا ہے یا وہ صلوٰۃ سہو ہے جس پر قرآن میں سخت وعید آئی ہے۔"

خاص طور پر جمع کی نماز جو صلوٰۃ مشہورہ ہے (بنی اسرائیل - ۷۸) اس میں جو شخص وقت پر نہیں پہنچا یا اس سے غیر حاضر رہتا ہے وہ تو اپنے آپ کو اس خطرے میں ڈال رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد کا لباس اس سے اٹار لیا جائے اور شیطان کے مقابلہ میں اس کے پاس کوئی پناہ باقی نہ رہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے:-

مَنْ صَلَّى صَلَوَاتِي فَهِيَ لِي وَمَنْ لَمْ يَلْبَسْهَا لَمْ يَلْبَسْ لِي وَمَنْ لَمْ يَلْبَسْهَا لَمْ يَلْبَسْ لِي وَمَنْ لَمْ يَلْبَسْهَا لَمْ يَلْبَسْ لِي  
 جس نے صبح کی نماز ادا کر لی وہ اللہ کے ذمے میں آگیا۔ جس نے نماز نہ کی وہ اللہ کے ذمے میں آگیا۔ جس نے نماز نہ کی وہ اللہ کے ذمے میں آگیا۔ جس نے نماز نہ کی وہ اللہ کے ذمے میں آگیا۔  
 جو اللہ کے نام سے اپنے ذمے کے متعلق کسی چیز کے بارے میں پوچھے۔  
 جو اللہ کے نام سے اپنے ذمے کے متعلق کسی چیز کے بارے میں پوچھے۔  
 جو اللہ کے نام سے اپنے ذمے کے متعلق کسی چیز کے بارے میں پوچھے۔  
 جو اللہ کے نام سے اپنے ذمے کے متعلق کسی چیز کے بارے میں پوچھے۔

فجر کی نماز حدیث کے الفاظ میں "اول نهار" کی نماز ہے، وہ دوسری نمازوں کا مقدمہ ہے، ہر روز جب صبح کی سپیدی سورج کے آنے کی خبر دیتی ہے تو دو طرح کے مواعظ انسان کے لیے کھلتے ہیں۔ ایک دنیا کا کام، دوسرا آخرت کا کام۔ عین اس وقت موزن بلند مقام پر کھڑے ہو کر آواز دیتا ہے:-

حَسْبِيَ عَلَى الصَّلَاةِ، حَسْبِيَ عَلَى الْفَلَاحِ  
 آؤ نماز کی طرف، آؤ کامیابی کی طرف۔

یہ پکار انسان کو دعوت دیتی ہے کہ وہ دن کی سرگرمیوں کو شروع کرنے سے پہلے خدا کے گھر میں آئے اور فجر کی نماز ادا کر کے اپنے اس ارادے کا اظہار کرے کہ وہ آنے والے لمحات کو آخرت کی کامیابی حاصل کرنے میں لگائے گا، وہ آنے والے دن کو خدا کی عبادت میں بسر کرے گا۔ عین اس وقت ایک اور پکارنے والا پکارتا ہے۔ یہ انسان کا دشمن شیطان ہے جو ایک ایک شخص کے دل میں یہ بات ڈالتا ہے کہ وہ اپنے دن کو صرف دنیا حاصل کرنے میں لگائے۔

پہلی پکار دیواروں سے ٹکرا کر واپس آجاتی ہے۔ ہزاروں کی آبادی میں صرف چند ایسے لوگ مسجد کے لیے نکلتے ہیں جو بڑھے ہوئے ہیں یا کسی اور کام کے قابل نہیں رہے ہیں۔ مگر دوسری پکار کو سن کر یہ شخص اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، کسان اپنے کھیتوں کی طرف چل پڑتے ہیں، تاجر کو بیوں کے بڑے بڑے پتھارے لے کر اپنی دکانوں کی طرف

۱۔ صلوٰۃ شہدہ کے معنی ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز، روبرو کی نماز۔

روان ہو جاتے ہیں۔ ملازم اپنے دفتروں کی تیاری شروع کر دیتے ہیں اور بہت سے لوگ جنہیں صرف آرام عزیز ہے وہ اس سہانے وقت میں اپنے نرم بستروں سے لپٹ جانے کو موزوں ترین خیال کرتے ہیں۔

کس قدر غافل ہے انسان جو اس وقت بھی محروم رہتا ہے جب کہ پانے کے امکانات سب سے زیادہ ہوں۔ ایک دروازہ، دوسرا دروازہ انسان کے لیے کھلتا ہے مگر نادان انسان ہر روز اسے اپنے اوپر بند کر لیتا ہے۔

صلوٰۃ فشرع کی دوسری پہچان یہ ہے کہ نماز میں آدمی کا بھگنا اس کی پوری زندگی میں اسی قسم کے بھکاؤ کا عنوان بن جاتا ہے۔ اس کا رکوع اور سجدہ دراصل اس بات کا ایک عملی اقرار ہے کہ اس نے پوری زندگی خدا کے آگے ڈال دی ہے وہ مکمل طور پر خدا کے حکم کا پابند بن چکا ہے۔ اسی لیے قرآن میں کہا گیا ہے:

إِنَّمَا الصَّلَاةُ تَشْتَقِي مَنْ أَحْسَنَهُ وَالْمُتَكَبِّرِ (مکوت - ۱۴۵) نماز پر کاربند اور رہا ہونے سے روکتی ہے۔

ایک نبی نے جب لوگوں کو خدا کا عبادت گزار بننے کی دعوت دی تو ان کی قوم، جس نے اپنی زندگی کی باگ اپنے نفس کے حوالے کر دی تھی اور کسی دوسرے نظام اطاعت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھی، اس نے جواب دیا:

يَا مُصَلِّبُ أَسْأَلُكَ تَأْتِمُرَكَ أَنْ تَسْتُرِكَ مَا نَعْبُدُ اِبْنَانًا وَأَرْأَى نَفْعَ نِيْ اَسْمَاءِ مَا نَشَاءُ عِبَادَتِمْ جَوْشُرْدِيْنَ عِن كِي عِبَادَتِمْ هَارِيْ بَابِ مَا دَا كَرْتِي اَسْمَاءِ

آئیے ہیں اور ہمارے مالوں میں ہماری مرضی کا کوئی دخل نہ ہو۔ ۸۶۔ ہود۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز محض رسمی قسم کی پوجا نہیں ہے بلکہ وہ اپنے وجود اور تمام اثنائے کو خدا کے آگے ڈال دینے کا نام ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ خدا کے حضور جھک کر زبان حال سے کہہ رہا ہے کہ میرے آقا تو مجھے ہم دے، میں تیرے حکم کی تعمیل کروں گا۔ اس اقرار کے باوجود اگر آپ کسی کو دیکھیں کہ اس کی مسجد کی نماز

اس کی پوری زندگی کی نماز نہیں بنی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ابھی تک صلوٰۃ فشرع سے محروم ہے۔ قرآن کی تفسیر کے مطابق میں نماز کے ساتھ: اتباع شہوات، پایا جا رہا ہو، وہابی نماز ہے جس سے روح صلوٰۃ منقطع

ہو چکی ہے (مریم - ۱۵۹)

بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ان کی نمازیں بہت اچھی نہ ہیں تاہم وہ نماز تو پڑھ لیتے ہیں اور یہ بھی بہ حال فرض کی ادائیگی کے لیے کافی ہے۔ مگر یہ صرف شیطان کا دھوکہ ہے۔ یاد رکھیے اللہ تعالیٰ کو جو چیز مطلوب

ہے وہ ذکر قلیل نہیں، بلکہ ذکر کثیر ہے۔ ذکر قلیل کو تو منافقوں کی پہچان بتایا گیا ہے۔ (ن - ۱۴۲)

صلوٰۃ فشرع کی تیسری اور آخری پہچان یہ ہے کہ بندہ جب نماز میں مشغول ہو تو وہ اپنے آپ کو خدا سے بالکل قریب محسوس کرے، جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

وَأَسْبَغَ دَاوُتُ قُرْبِيْ (ملق ۱۱) سجدہ کر اور قریب ہو جا

یہ سجدہ قریب کیا چیز ہے اس کو شاید لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ جب آدمی اس عالم میں پہنچتا ہے تو اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ ایک ان دیکھی حقیقت کو کامل یقین کے ساتھ دیکھ رہا ہے۔ ایک بعد ترین چیز ہے

جہائی طور پر قریب ہے، کسی غائب کی موجودگی کے بغیر کامیاب ترین کھگو میں معروف ہے۔ ایک سب سے زیادہ برکت چیرے لیے اپنے اندر سب سے زیادہ محبت کے جذبات پارا ہے۔ ایک چیز جس کو نگاہ کسی بھی واسطے کے ذریعہ عموماً نہیں کیا جاسکتا کسی واسطے کے بغیر وہ اس تک پہنچ گیا ہے:

گویا جگرہ جو ناز کی انتہائی حالت ہے، وہ بیک وقت خدا سے قریب ہونے کی بھی انتہائی حالت ہے۔ ناز کی شکل میں اللہ تمنا نے ہمارے لیے یہ انتظام کیا ہے کہ ہم دنیا میں رہتے ہوئے اس کی معیت اور قربت حاصل کر سکیں۔ ناز کے ذریعہ آدمی جب اپنے آپ کو خدا کی طرف متوجہ کرتا ہے تو وہ روحانی طور پر خدا سے جڑ جاتا ہے وہ یاد الہی کی ایسی حالت اپنے اوپر طاری کرتا ہے جب کہ وہ مکمل طور پر ایک حیاتی وجود بن جاتا ہے اور تھوڑی دیر کے لیے اپنے آپ کو خدا کے اندر گم کر دیتا ہے۔ وحدت وجود کا تصور غالباً اپنی ابتدائی شکل میں محض اس کیفیت کو تھانے کے لیے تھا جو تصور الہی میں غرق ہونے کے وقت آدمی کے اوپر طاری ہوتی ہے۔ مگر بعد کو منطقی نتیجے کی کوشش نے اس کو بہرہ اور مست کے ناقابل تم غلطے تک پہنچا دیا۔ اگر اس بدنام عقیدے کے متعلق سیری تشریح کو صحیح مانا جائے اور اس کو محض حیاتی ارتباط کے مفہوم میں لیا جاسکے تو میں کہوں گا کہ سجدہ قربت کے وقت آدمی پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اس کے اظہار کے لیے شاید انسانی زبان میں یہ ایک قریب ترین تعبیر ہے۔ جب سرنگ کا لٹھا آتا ہے، جب عجز اور محدودیت کا پیکر اپنے آپ کو لا محدود کمال کھول کر دیتا ہے، جب پیشانی اس طرح کھنچ اٹھتی ہے گویا وہ زمین سے چپک گئی ہے۔ اس وقت ایسا عموماً ہوتا ہے گویا قطرہ نے اپنے آپ کو سمندر میں ڈال دیا ہے گویا انسان خدا سے جلا ہے۔

### خاکتہ

یہ تلاوت تھی اور صلوة شروع کی مختصر ترین تشریح ہے جو میں نے آپ کے سامنے کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کچھ نئی باتیں نہیں ہیں۔ سہرہ شخص جس نے قرآن کو پڑھا ہے وہ ان باتوں کو بخوبی جانتا ہے۔ مگر اس کے باوجود میں نے آج آپ کے سامنے ان کو اس لیے دہرایا ہے تاکہ انھیں یاد دلا کر آپ سے یہ عہدوں کہ آپ ان کو اپنی زندگیوں میں مثال کریں گے۔ آپ میں سے ہر شخص کو کسی دوسرے سے نہیں بلکہ خود اپنے آپ سے اس معاہدہ پر سمیت کرنا ہے کہ وہ اپنے علم کو اپنا حاس بنائے گا۔ وہ کچھ جانتا ہے اس کو اکتیا کرنے کی کوشش کرے گا۔ اگر آپ سچ پچ یہ اقرار کریں تو یقین ماننے کہ یہ کائنات آپ کے لیے سلام درحیاتی آواز سے اس طرح گونج اٹھے گی کہ آپ کے کان اس کی آواز میں گئے، اور آپ کے لیے خدا کی جنت کے دروازے اس طرح کھول دیے جائیں گے کہ آپ جیتے ہی اس کی خوشبو محسوس کریں گے۔ اور اگر آپ اس عہد کے لیے تیار نہ ہوں تو وہ سب کچھ جو جلائے میں ہے اور وہ سب کچھ جو اندھیرے میں چھپا ہوا ہے، گواہ ہے کہ خدا کے جہاں اب آپ کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہا۔ ایک کہ اگر آپ ان باتوں کو پہلے سے جانتے ہیں، آپ نے خود اپنے اوپر محنت تمام کر دی ہے۔ اس کے بعد بھی اگر آپ اپنے کو نہیں بدلنے تو مجھے نہیں مسلم کہ آپ کے پاس وہ کونسا سہارا ہے جس کے بل پر آپ رب العالمین کے سامنے اتنی بڑی جسارت کر رہے ہیں۔ (زندگی ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ)

تقریر اجتماع جماعت اسلامی ہند، بمقام براہوں، ۱۲، اپریل ۱۹۶۱ء

## مومن کی تصویر

آج کا یہ اجتماع جس میں ہم آپ جمع ہوئے ہیں یہ گویا ایک دور کا فاتحہ اور دوسرے دور کا آغاز ہے جماعت اسلامی کی دعوت پر ملک کے گوشے گوشے سے یہاں جمع ہو کر آپ نے اس بات کا مظاہرہ کیا ہے کہ پچھلے پندرہ سال کے اندر ہم اس ملک میں کتنا کام کر چکے ہیں اور یہاں جو کارروائی انجام پائے گی وہ ہماری طرف سے اس بات کا اعلان ہوگا کہ آئندہ ہم اس ملک میں کیا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ گویا ماضی اور مستقبل کے درمیان کا ایک وقفہ ہے جس کو ہم دارالسلطنت یا قرآن کے الفاظ میں اس ملک کے ام القریٰ میں گزار رہے ہیں۔ اس وقت میں جو کچھ عرض کر دوں گا وہ ہمارے اس تاریخی دن کے دوسرے پہلو کا ایک جز ہے۔ خدا میری اور آپ کی مدد فرمائے۔

حضرت معاذ خدا کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی ایک گفتگو کی روداد ان الفاظ میں نقل

کرتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے کہا، کیا میں تمہیں بتاؤں کہ دین کا سرا کیا ہے اور اس کا ستون کیا ہے اور اس کی رسیٹہ لہند چوٹی کیا ہے۔ میں نے جواب دیا: ہاں اے خدا کے رسول! آپ نے فرمایا۔ دین کا سرا اسلام ہے، اس کا ستون نماز ہے اور اس کی چوٹی جہاد ہے۔

قَالَ اَلَا اَدَّلُكَ بَسْرَاسِ الْاْمْرُوْعُوْ جِدَّ وَدَّرُوْتَا سَنَا مِهْ قُلْتُ بَسِي يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ - قَالَ وَاَسْ اَلْمُهْرَ الْاِسْلَامَ وَعَمُوْدُوْهُ الصَّلَاةُ وَدَّرُوْتَا سَنَا مِهْ الْجِهَادُ

(احمد ترمذی ابن ابی)

اس حدیث کے مطابق دین کے تین درجے ہیں۔ اسلام، نماز اور جہاد۔ یہ تین الفاظ دراصل تین مختلف عمل کے عنوانات ہیں جو ایمان لانے کے بعد کسی کی زندگی میں ابھرتے ہیں۔ اسلام اس کا پہلا عمل اور اس کی بنیاد ہے اور نماز وہ چیز ہے جو اس عمارت کو اوپر اٹھاتی ہے اور جہاد اس کی آخری منزل ہے۔

سب سے پہلے اسلام کو کیجیے۔ اسلام کے معنی سپردگی اور خاگی کے ہیں۔ بندہ جب اپنے خدا کو پالے اور اپنے آپ کو بالکل اس کے حوالے کر دے تو اسی کو اسلام کہتے ہیں۔ اسلام اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک قسم کا فانی اللہ ہے جس میں بندہ اپنے آپ کو بھول جاتا ہے اور جمالی طور پر اپنے الگ وجود کو باقی رکھتے ہوئے نفسیاتی طور پر خدا کی ہیستی میں گم ہو جاتا ہے۔ یہ آدمی کے پورے وجود کا خدا کے تصور میں ڈھل جانا ہے۔ اسلام یہ ہے کہ ہمارا ذہن اس حقیقت پر بالکل مطمئن ہو جائے کہ اس کائنات کا ایک خالق اور مالک ہے۔ ہمارے احساسات میں وہ اس طرح شامل ہو جائے کہ رگ رگ میں ہم اس کی کھٹک محسوس کرنے لگیں۔ ہم اپنے آپ کو اس طرح اس کے حوالے کر چکے ہوں کہ کسی معاملے میں اس کے خلاف جانے کا تصور تک نہ کر سکیں۔ ہمارا ذہن اسی کے بارے میں سوچتا ہو اور ہمارے جذبات اسی کے لیے متحرک ہوتے ہوں، ہم سب سے زیادہ اس سے ڈرتے

ہوں اور سب سے زیادہ اس سے محبت کرتے ہوں۔ جس شخص کی یہ کیفیت ہو جائے وہی دراصل اسلام کو قبول کرتا ہے۔ اسلام سیر و تفریح میں وہ آخری قسم ہے جس میں بندہ اپنے فکر کو اپنے جذبات کو اپنے وجود کو اور اپنے سارے اٹانے کو خدا کے سپرد کر دیتا ہے اور اپنے پاس کچھ بھی باقی نہیں چھوڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کا ذکر ہے وہاں اسی لفظ کو استعمال کیا گیا ہے۔ حضرت ابراہیم نے خواب دیکھا کہ وہ اپنے لڑکے کو ذبح کر رہے ہیں۔ انھوں نے سمجھا کہ خدایا مجھ سے میرے لڑکے کی قربانی مانگ رہا ہے۔ چنانچہ انھوں نے فوراً لڑکے کو لیا اور اس کو لٹا کر اس کی گردن پر چھری رکھ دی۔ اس واقعہ کا ذکر قرآن میں ان لفظوں میں آیا ہے:

فَلَمَّا أَسْلَمْنَا وَبُنَيْنَا لَهُ أُلْحٰبٌ  
 جب وہ دونوں سلم ہوئے اور ابراہیم نے اسخیل کو  
 پیشانی کے بل ڈال دیا۔ (صافات ۱۲۳)

حضرت ابراہیم کا یہ عمل اسلام کی حقیقی تصویر ہے۔ یہ حواگی اور سپردگی کی انتہا ہے کہ خدا کی طرف سے جو حکم بھی آئے بندہ فوراً اس کی تعمیل کے لیے تیار ہو جائے۔ حتیٰ کہ اگر اس کو نموس ہو کر اس سے اپنے لڑکے کو ذبح کرنے کے لیے کہا جا رہا ہے تو وہ بے تکلف اپنے کٹت جگر کو زمین پر لٹائے اور اس کی گردن پر چھری چسلا دے۔

یہی اسلام خدایا پرستانہ زندگی کا آغاز ہے جب آدمی اس طرح مسلم اور مطیع ہو جائے تو وہ دین کا سرا بکڑتا ہے۔ اس عمل حواگی کے بغیر کسی کی زندگی حقیقی معنوں میں خدایا پرستانہ زندگی نہیں بن سکتی۔ اس حواگی میں جتنی کمی ہوگی اسی کے بقدر آدمی کی زندگی میں کمی رہ جائے گی۔ مثلاً ایک شخص نے اگر اپنے ذہن کو خدا کے حوالے کیا ہے مگر اس کے احساسات پر خدا کا غلبہ نہیں ہوا ہے تو وہ اسلام کا صرف ایک دیکل بن کر رہ جائے گا۔ وہ اسلام کے لیے ٹھنڈے کرے گا اور دوسروں پر تنقید کرنے میں اس کی زبان بہت تیز ہوگی۔ مگر اس کی اپنی زندگی خدایا پرستی سے خالی ہوگی۔ کوئی شخص اگر اسلام کی طرف اس طرح آئے کہ وہ دنیا اور آخرت دونوں کا نفع حاصل کرنا چاہتا ہو تو وہ خدایا پرستی کو اسی حد تک اختیار کرے گا جس حد تک اس کے دنیوی مفاد کو نقصان نہ پہنچے۔ جہاں اس کا دنیا کا فائدہ خطہ میں نظر آیا وہ خدایا پرستی کو ترک کر دے گا اور دنیا کے بت کو پوجنے لگے گا جو شخص کسی سطحی ناثر یا وقتی جذبات کے تحت اسلام کی طرف مائل ہوگا وہ چند دنوں تو بڑی سرگرمی دکھائے گا مگر اس کے بعد ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ یا جہاں سے آیا تھا وہیں واپس چلا جائے گا۔ جو شخص اسلام کی طرف اس طرح آئے کہ وہ اپنی خودی کے بت کو بھی ساتھ لیے ہو وہ خدا کے دین کی ان چیزوں کو بڑی خوشی سے لے لے گا جو اس کے ذوق کے مطابق ہوں گی اور جو چیز اس کے ذہنی سانچے میں نہ پڑتی ہوگی وہ اسے رو کر دے گا۔ جو شخص اسلام کے ناقص مطالعہ کے تحت محض اس کے بعض پہلوؤں سے متاثر ہو کر اسلام کی طرف آئے وہ اپنے پسندیدہ پہلوؤں کے بارے میں تو اتنی گراگم تقریر کرے گا گو کیا وہ صحابہ کرام سے بھی آگے بڑھ گیا ہے۔ مگر دوسرے پہلوؤں سے اسے کچھ زیادہ

دل چپ نہ ہوگی۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اسلام کو اپنے قومی اور تحرکی جذبات کی تکلیف کے لیے اختیار کرے تو وہ قومی جوش و خروش اور تحرکی اخلاقیات میں تو بہت نمایاں نظر آئے گا۔ مگر حقیقی اسلامی اسپرٹ اور اسلامی اخلاقیات کا اس کے اندر کہیں پتہ نہ ہوگا۔ حتیٰ کہ جو لوگ مکمل حواگی کے بغیر دین کی طرف آئیں ان کی کمزوریاں اس حد تک پہنچ سکتی ہیں کہ ایک شخص کو صبح سات بجے کسی دینی کام کے لیے بلا جائے گا اور وہ کہے گا کہ میں اتنے سویرے نہیں آسکتا کیونکہ وہ میرے چائے پینے کا وقت ہے۔ ایک شخص کو کسی اسلامی اجتماع کے پروگرام میں حصہ لینے کے لیے مات کو گیارہ بجے کا وقت دیا جائے گا اور وہ جواب دے گا کہ گیارہ بجے تک میرے لیے سوچنا ضروری ہے۔ اس لیے میں اس پروگرام میں شریک نہیں ہو سکتا۔ ایک شخص سے کہا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو جو صلاحیت دی ہے اس کو دین کی خدمت میں لگا دو مگر وہ کہے گا کہ میں تو دنیا کی خدمت کروں گا کیونکہ دنیا کے بازار میں میری صلاحیتوں کی زیادہ قیمت مل رہی ہے۔ ایک شخص اسلام کا دعویٰ کرنے کے باوجود ہر وقت کھانے کپڑے کی فکر میں مبتلا رہے گا، اس کی مجلس میں ہر وقت روپے پیسے کا تذکرہ ہوگا اور جب اس سے کہا جائے گا کہ مسکن کے گھر میں خدا اور آخرت کا چرچا ہونا چاہیے تو وہ بگڑ کر بولے گا کہ ہاں یہ یمن کا نہیں کافر کا گھر ہے۔ ایسا شخص اپنے آپ کو اسلام کے علمبردار کی حیثیت سے پیش کرے گا لیکن اگر اس کی روزانہ کی زندگی کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اسلام سے زیادہ اس کا ذہن اپنے ذاتی مسائل میں لچپی لیتا ہے، وہ اپنی اسلامی ذمہ داریوں کو پورا کرنے سے زیادہ نجی قسم کے مشغلوں میں اپنا وقت صرف کر رہا ہے، وہ اپنی معاش کمانے اور اپنے بوجی بچوں کے مطالبات پورے کرنے کے لیے تو سارے حقیقت میں منکر اسلام کا کوئی کام کرنا ہو تو معمولی معمولی باتوں کو عذر بنا لیتا ہے۔ اس قسم کی کمزوریاں جہاں نظر آئیں سمجھ لیجیے کہ اس کا ایک ہی سبب ہے، وہ یہ کہ آدمی کے اندر مکمل حواگی کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی ہے۔ وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ خدا کے دین کی طرف نہیں آیا ہے۔ اس نے ادھوری شکل میں اسلام قبول کیا ہے۔

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ بعض احادیث میں چند مخصوص چیزوں کو ۱۰ اسلام کہا گیا ہے۔ مثلاً حدیث جبریل میں ہے کہ آپ سے پوچھا گیا: اے محمد! بتائیے اسلام کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا: ۱۰ اسلام یہ ہے تم لا اللہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو اور بشرط استطاعت بیت اللہ کا حج کرو۔ اس طرح کی اور بھی روایتیں ہیں جن کو دیکھ کر بظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید یہی وہ چند چیزیں ہیں جن کے جوڑے کا نام اسلام ہے مگر اس قسم کا شبہ دہی کر سکتا ہے جو ان احادیث کو پوری شریعت سے الگ کر کے دیکھے۔ قرآن و حدیث کی ساری تعلیمات کو سامنے رکھ کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ چند چیزیں کل اسلام نہیں ہیں بلکہ یہ اسلام کے چند علامتی پہلو ہیں۔ کلید توحید کا اقرار اپنے اندر ایک فکری انقلاب کا اعتراف ہے۔ نماز اس بات کا اظہار ہے کہ آدمی اپنے پورے وجود کے ساتھ خدا کے آگے جھک گیا ہے۔ زکوٰۃ اپنے مال و اسباب کو خدا کے لیے وقف کر دینے کا اعلان ہے۔ روزہ اس بات کا

عوم ہے کہ بندہ اپنے رب کی خاطر ساری مشقتیں بھیلنے کے لیے تیار ہے اور حج گویا آدمی کی طرف سے اس بھاری کا اظہار ہے کہ وہ دنیا اور اس کی تمام چیزوں کو چھوڑ کر خدا تک پہنچ جانا چاہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کلمہ توحید اور نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ بذات خود مکمل اسلام نہیں ہیں بلکہ یہ اسلام سے پیدا ہونے والی اندر دلی کیفیات کے چنڈا نشان ہیں۔ یہ مکمل حوالگی کی علامتی تصویر ہے نہ کہ انھیں کا نام مکمل حوالگی ہے۔

یہ چیزیں جن کا حدیث میں ذکر ہے یہ شریعت کی وہ مخصوص چیزیں ہیں جن کو ہمارے اوپر فرض قرار دیا گیا ہے اور فرائض کے متعلق سمجھ لینا چاہیے کہ وہ راستے کی حد نہیں ہیں بلکہ وہ صرف راستے کی سمت بتاتے ہیں۔ یہ فرائض ایک طرح کی لازمی تربیت ہیں جو ہم کو مخصوص وقتوں میں ایک مقررہ عمل کر کے اس بات کی تعلیم دیتے ہیں کہ بقیہ وقت میں ہمیں کیا کرنا ہے۔ ان کی حیثیت محض علامات کی ہے نہ کہ ذمہ داریوں کے حدود متعین کرنے کی۔

ایک مثال سے اس کی وضاحت ہو جائے گی۔ نومبر ۱۹۵۹ء میں جب ہندوستان میں چینی جارحیت کا خطرہ بہت بڑھ گیا تھا۔ احمد آباد کے ۲۵ ہزار طلبہ نے یہ عزم کیا کہ وہ ملک کے دفاع کے لیے لڑیں گے اور اپنی جان دے کر چینی حملہ کا مقابلہ کریں گے۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد ان میں سے ہر شخص نے ایک ایک پیسہ دے کر ۲۵ ہزار پیسے جمع کیے اور ان کو ہندوستانی وزیر اعظم کی خدمت میں پیش کیا۔ پیسے دیتے ہوئے انھوں نے وزیر اعظم سے کہا کہ یہ ہماری طرف سے اپنے آپ کو آپ کے حوالے کرنے To give ourselves to you کا نشان ہے۔ یہ وقت کی ایک مثال ہے جس سے ہم اسلامی فرائض کی حقیقت سمجھ سکتے ہیں۔ بندہ فرائض اور واجبات کی شکل میں اپنے وجود کا تھوڑا حصہ خدا کو دے کر اس بات کا عہد کرتا ہے کہ وہ اپنا پورا وجود خدا کو دینے کے لیے تیار ہے۔ وہ اپنی بعض خیمیتوں میں سے کچھ دے کر تمام خیمیتوں سے اپنا سب کچھ اس کے حوالے کرنے کا ارادہ ظاہر کرتا ہے۔

اب نماز کو لیجیے جو اس سلسلے کی دوسری چیز ہے۔ جب کوئی شخص مکمل حوالگی کے ساتھ خدا کی طرف بڑھتا ہے تو اس کے بالکل قدرتی نتیجے کے طور پر اس کی پوری زندگی ذکر اور دعائیں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اسی ذکر اور دعائے ایک مخصوص صورت کا نام نماز ہے۔ اہل ایمان کی تعریف قرآن میں سید عذوبت ریحیم خذوا و طلعوا (سورہ ۱۱۰) کے الفاظ میں کی گئی ہے۔ یعنی وہ اپنے رب سے ڈرتے ہوئے اور اس کی رحمتوں کی تمنا کرتے ہوئے اسے پکارتے رہتے ہیں۔ جن واقعات کو دیکھ کر لوگ دوسری چیزوں کو یاد کرتے ہیں ان کو دیکھ کر مومن خدا کے تصور میں غرق ہو جاتا ہے۔ اگر وہ کسی جنازے میں شریک کے لیے قبرستان جانا ہے تو یہ موقع اس کے لیے تمنا کی لوگوں سے ملاقات کی تقریب نہیں ہوتی بلکہ کھودی جانے والی قبرس کے لیے ایک کھلا ہوا دروازہ بن جاتی ہے جس سے وہ آخرت کی حقیقتوں کو دیکھنے لگتا ہے۔ اگر وہ کسی عالیشان مکان میں اپنے آپ کو پائے تو وہ اس کے نقش و نگار دیکھنے میں محو نہیں ہو جاتا بلکہ وہ بے اختیار کہہ اٹھتا ہے کہ خدایا مجھے ایسا مکان

نہیں چاہیے میں تو تیری رحمت اور مغفرت کا طلب گار ہوں اور وہی تو مجھ دے دے۔ اگر وہ کسی تاریخی کھنڈر کے سامنے کھڑا ہو تو وہ اس کو محض آسمان قدیم کے طور پر نہیں دیکھتا بلکہ اس سے یہ عورت حاصل کرتا ہے کہ ان آبادیوں کے بسنے والے اپنی آبادیوں کو چھوڑ کر جس دنیا میں چلے گئے ہیں وہیں مجھ کو بھی جانا ہے۔ اگر وہ کسی جدید طرز کے کارخانے میں داخل ہوتا ہے اور دیکھتا ہے کہ جو کام پہلے سخت قسم کی انسانی محنت سے انجام پاتا تھا، اس کو تیز رفتاری سے انجام دے رہی ہیں اور انسان ان کے سامنے کھڑا ہوا صرف ان کی نیک بھالی کر رہا ہے تو اس کو ”صنعتی انقلاب کے عجائب یاد نہیں آتے بلکہ وہ کارخانے کی شکل میں خدا کے انعامات کو دیکھنے لگتا ہے۔ وہ پکار اٹھتا ہے کہ خدایا تو نے انسان کو وہ سب کچھ دے دیا ہے جس کی اسے ضرورت تھی۔ تو نے اسے ایک ایسی کائنات دی ہے جو اپنے ساز و سامان کے ساتھ گویا اس بات کا اظہار کر رہی ہے کہ انسان اگر ایک مہن دہا دے اور ساری کائنات اس کی خدمت کے لیے حرکت میں آجائے۔

اسی طرح وہ خود تجھے مل کر رہا ہے وہ بھی خدا کو اپنی طرف مائل کرنے کی ایک کوشش ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مومن کا بھل اپنے رب سے درخواست ہے۔ جب وہ کسی کی عیب پوشی کرتا ہے تو گویا وہ خدا سے اس کا منہی ہوتا ہے کہ وہ قیامت کے دن اس کے عیبوں کو چھپائے۔ جب وہ کسی کے ساتھ فیاضی کا معاملہ کرتا ہے اور اس کے حق سے زیادہ اسے دیتا ہے تو درحقیقت وہ دعا کرتا ہے کہ مالک متقی اس کے ساتھ بھی اسی طرح فیاضی کا معاملہ کرے حتیٰ کہ جب وہ اپنے بچے کو گود میں لیتا ہے تو اس وقت بھی اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آجاتے ہیں اور وہ کہہ اٹھتا ہے کہ خدایا بچہ تھنا کر ورہے میں اس سے زیادہ تیرے سامنے بے بس اور کمزور ہوں تو میری مدد فرما! وہ کہتا ہے کہ میرے رب! جس طرح ایک چھوٹا بچہ کھتا ہے تو شیفتق باپ لپک کر اسے اٹھالیتا ہے اسی طرح میں تیری طرف آنا چاہتا ہوں، مگر اپنے کمزور قدموں کے ساتھ میں تجھ تک نہیں پہنچ سکتا۔ تو ہاتھ جڑھا کر مجھے اٹھالے!

نماز درحقیقت اسی مومنانہ زندگی کا نشانہ اور اس کا مرکزی نقطہ ہے۔ مومن کی پوری زندگی نماز ہوتی ہے، مخصوص اوقات میں جب وہ نماز پڑھتا ہے تو گویا وہ اپنی حالت نماز میں ہونے کی حیثیت کو محسوس اور مکمل کرتا ہے، نماز بندگی کی تقویٰ ہے۔ نماز اپنے رب سے قریب ہونے کی کوشش ہے۔ نماز خدا کے ربار میں حاضری کا وقت ہے۔ نماز ان جذبات کا ایک خارجی مظہر ہے جو مومن کے سینے میں ٹوٹ رہے ہوتے ہیں نماز ایک لحاظ سے دعا ہے، وہ اپنی عاجزی کو پیش کر کے خدا سے اس کی رحمت و مغفرت مانگتا ہے اور دوسرے لحاظ سے وہ اسی تم کا ایک بتیاباد عمل ہے جو ایک شخص اپنے محبوب دوست کے لیے کرتا ہے جب کہ وہ اس سے بچھڑ گیا ہو اور تصور کی دنیا میں اس تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ نماز خدا کا اپنے بندے کی طرف آنا اور بندے کا اپنے رب تک پہنچ جانا ہے۔ بندہ جب نماز میں مشغول ہوتا ہے تو وہ دوسری تمام حالتوں کے مقابلے میں خدا سے زیادہ قریب ہوتا ہے چنانچہ نماز کے وقت اس کو ایک خاص طرح کی قربت کا احساس

ہوتا رہتا ہے مگر جوں ہی نماز پوری کر کے وہ سلام بھرتا ہے اس کی کیفیت بدل جاتی ہے۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی ایرکنڈیشنڈ عمارت سے لپکا لپکا باہر آ گیا ہو۔ مختصر یہ کہ نماز وہ مقام ہے جہاں خدا اپنے بندوں سے ملاقات کرتا ہے۔ جس طرح جنت کی زندگی کے بارے میں آتا ہے کہ جب جنتیوں کو خدا کا دیدار کرایا جائے گا تو وہ جنت کے بہترین آرام و عیش و عشرت جہول جائیں گے اور انھیں محسوس ہوگا کہ یہ سب سے بڑی نعمت ہے جو انھیں نصیب ہوئی ہے۔ اسی طرح کیفیت سے بھرا ہوا ایک سجدہ ایسا سجدہ جس سے سر اٹھانے کا جی نہ چاہے دنیا کی تمام نعمتوں سے زیادہ لذیذ ہے۔ ایسے سجدوں والی نماز ہی حقیقی منوں میں نماز ہے اور جس کو ایسے سجدوں کی توفیق نہیں ہوتی وہ گویا ابھی تک نماز سے آشنا ہی نہیں ہوا۔ ایسے شخص سے میں خدا کے رسول کی زبان میں کہوں گا: اَرْجِعْ نَفْسَكَ لَكَ لَمْ تُصَلِّ۔ (جاؤ اور پھر سے نماز پڑھو، کیونکہ تم نے ابھی تک نماز نہیں پڑھی) عادت میں نماز کو دین کا ستون کہا گیا ہے۔ یہ نماز کے ترقیبی پہلو کی طرف اشارہ ہے۔ نماز مومن کی تربیت ہے۔ ایک طرف وہ آدمی کے اندر وہ خصوصیات پیدا کرتی ہے جن سے وہ دین کا حامل بن سکے۔ اور دوسری طرف وہ آدمی کو اس مقصد کے لیے تیار کرتی ہے کہ وہ جنت کا علمبردار بن کر دنیا کے سامنے کھڑا ہو۔ نماز کے یہ دونوں فائدے سورہ مزمل کی آیتوں میں بیان کئے گئے ہیں، ارشاد ہوا ہے:-

يَا أَيُّهَا الْمَرْمِلُ ۖ فِيمَ اللَّيْلِ لَا أَكَلَيْتَ ۖ	۱۔ چادر اوڑھنے والے! راتوں میں
نَهَضْتَهُ ۖ وَأَنقَضْتَهُ مِنْهُ قَلِيلًا ۖ وَأَرْزُقْ عَلَيْهِ	قیام کر تھوڑے حصہ کو چھوڑ کر یعنی آدمی رات یا
دُرْتِلَ الْقُرْآنَ تَسْرِيَةً ۖ إِنَّا سَمِعْنَا عَلِيَّكَ	اس سے کچھ کم یا اس سے کچھ زیادہ اور قرآن کو ٹھہر
قَوْلًا نَفِيذًا ۖ إِنَّ نَاسِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ	ٹھہر کر پڑھو۔ ہم تم پر ایک بیماری بات اتارنے والے
وَطَأًا وَأَقْوَمُ تَبِيئًا ۖ إِنَّ لَكَ فِي السَّمَاوَاتِ مَجْمَا	ہیں بے شک رات کو انھیں انفس کو خوب کھتا ہے
طُونِيَّةً ۖ وَذُكْرًا سَمِ دَبَابِكَ وَتَبْتَلُ إِلَيْهِ	اور ایسی حالت میں جو بات نکلتی ہے وہ بھی بہت
تَبْتَلِيئَةً ۖ	درست ہوتی ہے۔ دن کے وقت تمہیں یہی خشونت

(مزل: ۱۰-۱۸)

ہوتی ہے اور اپنے رب کے نام کا ذکر کر اور ہر طرف سے کٹ کر اسی کا ہوجا۔

ان آیات میں نماز کے ایک پہلو کو وُطِئاً شَدِيداً کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جس سے آدمی مقال اقوم (درست گفتگو) کے قابل بنتا ہے اور اس کے دوسرے پہلو کو ذُكْرًا سَمِ دَبَابِكَ کہا گیا ہے جس سے تَبْتَلُ اِنِّ اللّٰهَ اِذَا ذَكَرْتَ اللّٰهَ حَيْثُ وَا كَا فَا نَدُهٗ حَاصِل ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے اوپر جنت کی تبلیغ کرنے کی جو ذمہ داری ہے وہ ایک نہایت گراں بار ذمہ داری ہے جس کو اوپر کے مگرے میں قول ثقیل کہا گیا ہے۔ اس قول ثقیل کا بوجھ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی زبردست ریاضتیں کر کے اپنے اندر وہ قوت پیدا کرے جس سے اس کا بوجھ اٹھانا آسان ہو جائے۔ اس ریاضت

کا طریقہ یہی قرأت والی طویل نمازیں ہیں جن کا بہترین وقت رات کی تمنا ہی ہے۔ رات میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا ایک بڑا شقت کا عمل ہے جس کو یہاں وطأ شدید بہت روز نما، کہا گیا ہے۔ اس وطأ شدید کے ذریعہ میں اپنے نفس کو کھتا ہے اور اس حالت میں قرآن پڑھ کر اپنے ذہن کو صاف اور دل کو پاک کرتا ہے۔ اس طرح تربیت پاکر وہ انسان تیار ہوتا ہے جو اعلیٰ اخلاقی اوصاف رکھنے والا ہوا اور مقال اقوم کے ساتھ تبلیغ کا فریضہ انجام دے سکے۔ رات کو خدا کے سامنے کھڑا ہونا آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ دن کو ننگان خدا کے سامنے کھڑا ہوا اور خدا کے کلام کے مطالعہ سے اس کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہوتی ہے کہ وہ خدا کی طرف سے بول سکے۔ نماز کا دوسرا پہلو ذکر اسم رب ہے جو قبل الی اللہ کی کیفیت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ یعنی خدا کی یاد میں اس قدر مشغول ہونا کہ ذہنی حیثیت سے آدمی ایسا ہو جائے گویا وہ دنیا سے کٹ کر خدا سے جڑ گیا ہے۔ یہ نماز صرف یاد کی شکل میں بھی ہوتی ہے جس کو قرآن میں ذکر کثیر کہا گیا ہے اور قیام و تہجد اور رکوع و سجود کی شکل میں بھی جو نماز کی مخصوص صورت ہے۔ آدمی جب دن کے وقت اپنی مشغولیوں میں خدا کو یاد کرتا رہتا ہے اور جب مخصوص اوقات کے آتے ہی وہ خدا کے حکم کی تعمیل میں مجد کے لیے روانہ ہو جاتا ہے تو اس کے ذریعہ سے وہ اس بات کی تربیت حاصل کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو مادی دنیا سے ہٹا کر روحانی دنیا کی طرف لے جائے۔ وہ دنیا میں رہتے ہوئے اس کی دلچسپیوں سے اس قدر بے تعلق ہو جائے گویا کہ وہ خدا کا راہب بن گیا ہے۔ اس طرح ذکر اور نماز آدمی کو مادی آلائشوں سے پاک کر کے اس قابل بناتے ہیں کہ وہ دنیا کے اوپر آخرت کو ترجیح دے سکے۔ فانی دنیا کو چھوڑ کر باقی رہنے والی دنیا میں اپنا دل لگا سکے۔

خدا کی راہ میں نفس کو کچلے بغیر آدمی کے اندر وہ سوز پیدا نہیں ہو سکتا جو دعوت حق کی جان ہے اور نہ اس کے بغیر کسی کو موغظ السنہ کی وہ زبان حاصل ہو سکتی جو دلوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ دائمی کی زندگی سراپا اپنے نظریات کا مجسمہ بن گئی ہو۔ اس کے منہ سے جو الفاظ نکلیں وہ محض الفاظ نہ ہوں بلکہ اس کی اپنی زندگی ان کے اندر کھینچ آئی ہو۔ دعوت حق کے کام کے لیے علمی قابلیت کی ڈگریاں درکار نہیں ہیں بلکہ اس کے لیے ایسی زندگی کی ضرورت ہے جو اپنی ترجمان آپ ہو، جو بولنے سے پہلے بول رہی ہو، اس کو ایسے دل کی ضرورت ہے جو اس میں غل رما ہو کہ لوگ اپنے رب کو کھیل گئے ہیں۔ جو ساری فکر دلوں کو چھوڑ کر اس فکر میں دیوانہ ہو جائے کہ کس طرح لوگوں کو جنم کے راستے سے ہٹا کر جنت کے راستے کی طرف لگایا جائے اور آدمی کے اندران خصوصیات کو پیدا کرنے والا ایک ہی نسخہ ہے اور وہ نماز ہے، ایسی نماز جس میں مشغول ہو کر بندہ اپنے آپ کو خدا سے قریب کرتا ہے۔ جس کے ذریعہ وہ خدا سے جڑ جاتا ہے۔ یہ نماز دائمی کاسب سے بڑا سراپہ ہے۔ اگر کوئی شخص سمجھتا ہے کہ وہ نماز کو اپنی زندگی میں شامل کیے بغیر حق کا دائمی بن سکتا ہے تو یقیناً ایک غلط فہمی ہے اور حتمی جلد وہ اس غلط فہمی سے نکل آئے اچھا ہے۔

نماز کی اسی اہمیت کی بنا پر حضرت مہر نے اپنی خلافت کے زمانے میں تمام ممالک کے نام ایک مکتوب

روانہ کیا جس میں یہ درج تھا کہ:-

تمہارے معاملات میں سب سے اہم چیز میرے  
نزدیک نماز ہے جو شخص نماز کی حفاظت کرے گا  
اور اس پر قائم رہے گا وہ اپنے دین کو محفوظ رکھے گا  
اور جو شخص نماز کو ضائع کر دے وہ دوسری چیزوں  
کو اور زیادہ ضائع کرنے والا ہوگا۔

اِنَّ اَھمَّ اُمُوْرٍ کُمُ عِنْدِی الصَّلٰوۃُ  
مَنْ حَفِظَهَا وَحَافِظَ عَلَیْہَا حَفِظَ  
دِیْنَهُ وَمَنْ ضَعَفَهَا ضَعُفَ لِبَیْتِہَا  
اَضْبَعِ - (مالک)

تیسری چیز جہاد ہے۔ جہاد کا مطلب یہ ہے کہ آدمی نے جس طرز زندگی کو خود اختیار کیا ہے اسی کی طرف  
دوسروں کو لانے کی کوشش کرے۔ دعوتِ حق اور جہاد دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک لفظ سے  
اس کی نوعیت کا اظہار ہوتا ہے اور دوسرے سے اس کی کیفیت کا۔ یا ان دونوں کے فرق کو ہم اس طرح  
بھی بیان کر سکتے ہیں کہ دعوتِ اس کی ابتدا ہے اور جہاد اس کی انتہا۔ ایمان لانا دوسرے نفلوں میں ایک حقیقت  
کا اکتشاف ہونا ہے۔ اس حقیقت سے جب آدمی دوسروں کو آگاہ کرنا چاہے تو اسی کو جہاد کہتے ہیں۔ یہ جہاد ابتدا  
زبان سے شروع ہوتا ہے۔ مگر اپنے آخری درجے میں کبھی داعی کو تلواروں کے سایہ اور پھانسی کے تختے پر  
کھڑے ہو کر حقیقت کا اعلان کرنا ہوتا ہے۔ جو ان تمام مراحل سے گزر کر اپنی ساری کوشش امرِ حق کے اعلان و اظہار  
میں صرف کر دے، وہی جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

اس جہاد میں بظاہر دوسروں کے خلاف جدوجہد ہوتی ہے مگر حقیقتاً یہ خود اپنے ساتھ جدوجہد کرنا ہے  
جو شخص اپنے آپ سے لانے کی طاقت رکھتا ہو وہی دوسروں سے لڑ سکتا ہے۔ جہاں آپ کو زیر کر کے وہی دوزخ  
پر غالب آ سکتا ہے۔ داعی اور جہاد بننے کے لیے سب سے پہلی ضروری چیز یہ ہے کہ آدمی خود اپنی زندگی میں اس  
چیز کو قائم کر چکا ہو جس کو وہ دوسروں کی زندگی میں قائم کرنے کے لیے اٹھائے۔ وہ ان باتوں پر سب سے پہلے  
خود ایمان لائے جن کو وہ دینا کے سامنے پیش کرنے جا رہا ہے۔ وہ خود اس چیز کے لیے تیار ہو چکا ہو جس  
کی طلب وہ دوسروں کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ جو اس حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہو جس کو وہ  
نفلوں کے ذریعہ دوسروں کو دکھانا چاہتا ہے۔ داعی کے سامنے ایک طرف اس کے مخاطب ہوتے ہیں دوسری طرف  
وہ دنیا ہوتی ہے جس کے حالات اسے لوگوں کو تہمتے ہوتے ہیں، اس لیے وہ انتہائی بے بسی پر کھڑا ہوتا ہے تاکہ وہ  
سامنے کی دنیا اور پیچھے کی دنیا دونوں کو دیکھ سکے۔ اپنی بات پر سب سے پناہ یقین اور خدا کے اوپر بے پناہ اعتماد ہی  
دو چیزیں خدا کے لیے کوشش کرنے والوں کا سرمایہ ہیں۔ آپ حقیقی منوں میں داعی اسی وقت بن سکتے ہیں جب آپ  
کا حال یہ ہو کہ آپ کسی کی غلط روش پر تنقید کریں تو دردی شدت سے آپ کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑیں۔ آپ کی  
دعوتی تحریریں بازار سے خریدی ہوئی روشنائی سے نہ لکھی گئی ہوں بلکہ اپنے خون سے تیار کی گئی ہوں جس میں  
آپ نے خود اپنے کو پختہ کر دیا ہو۔ اسی طرح اگر آپ مقرر ہیں تو آپ کا حال یہ ہونا چاہیے کہ جب آپ ایچ پر

تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوں تو آپ کا دل بے قرار ہو جائے اور آپ اپنے رب سے عرض کریں کہ خدایا! جو کچھ تو آخرت میں ان کے سامنے کھولنے والا ہے اس کو میں دنیا میں ان کے سامنے کھولنا چاہتا ہوں۔ تو مجھ سے کی تو فیض دے۔ جو شخص اس مقام سے بول سکے وہی دراصل دائمی بن سکتا ہے اور جس کے اندر یہ مصلحت ہو اس کو جاننا چاہیے کہ وہ ابھی دائمی بننے کے قابل نہیں ہوا ہے۔ اس کو دوسروں کی اصلاح کے لیے اٹھنے سے پہلے خود اپنی اصلاح کرنی چاہیے۔

لوگوں کو خدا کی طرف بلانا، دنیا میں نظام عدل قائم کرنا، شیطان اور طاغوت کے خلاف جنگ کرنا، یہ جہاد نبی سبیل اللہ کے میدان ہیں۔ نیکو بی جہاد نبی سبیل اللہ کا مقصود مطلوب نہیں ہے۔ جہاد اصل میں مومن کو مشکلات میں ڈال کر اس کا استقامت لینا ہے اور اس کو ایک ایسا موقع فراہم کرنا ہے جس کے ذریعہ وہ اپنی ارتقا کے لامحدود منازل طے کر سکے۔ جس طرح انسان کے مادی وجود کو باقی رکھنے اور اس کو نشوونما دینے کے لیے زمین و آسمان کی بے شمار چیزیں درکار ہیں۔ ٹھیک اسی طرح انسان کے روحانی ارتقا کے لیے ایک وسیع میدان بلکہ پوری کائنات کی ضرورت ہے۔ نظام اسلامی کا تمام اسی پھیلے ہوئے پردگرم کا ایک جزو ہے جو سماجی زندگی کے ساتھ موزنہ انداز میں کردار کو ظاہر کرتا ہے۔ اس لحاظ سے جہاد کی تکمیل یہ نہیں ہے کہ آپ دنیا میں نظام حق قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں بلکہ جہاد کی تکمیل یہ ہے کہ آپ اپنی قوتوں کا آخری حصہ تک اس راہ میں صرف کر دیں۔ خدا کے یہاں جن لوگوں کا شمار انبیاء اور شہداء میں ہو گا ان میں ایسے بھی لوگ ہوں گے جو ساری جدوجہد کے باوجود وقت کی سوسائٹی کو بدل دینے میں کامیاب نہیں ہوئے اور ایسے بھی لوگ ہوں گے جن کے سپنام کو اتنی بڑی اکثریت نے قبول کر لیا کہ وہ سوسائٹی کا دین بن گیا۔ یہ دونوں قسم کے لوگ خدا کے نزدیک کامیاب لوگ ہیں۔ ان کے درمیان خدا کے یہاں کوئی تفریق نہیں کی جائے گی بلکہ وہ سب کے سب یکساں اعزاز و احترام کے مستحق ہوں گے۔ کیونکہ جہاد کے نتیجے کا تعلق دوسروں سے ہے نہ کہ جہاد کر کے والوں سے۔ جب خادم نے اپنا کام پورا کر لیا تو بہرحال وہ اپنی خدمت کا صلہ پانے کا مستحق ہو گیا۔ خواہ دوسرے لوگوں نے اس کی خدمت کو تسلیم کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

اس جدوجہد کا پردگرم کیا ہے، اس کو جاننے کے لیے آپ کو درجہ جانے کی کوئی ضرورت نہیں؛ یہ واقعہ جو حقیقت آپ کے ادراک تک پہنچا ہے آپ کے ماحول کے بے شمار لوگ اس سے ناواقف ہیں۔ بس یہی آپ کے پردگرم کو شیعین کر دیتا ہے۔ اسلامی شعور حاصل ہونے کے بعد جب ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ زندگی امتحان کی زندگی ہے اور ہر شخص جنت یا جہنم کی طرف بھاگا چلا جا رہا ہے تو اسی سے یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنی قوم کو آنے والے دن سے جو شمار کریں۔ ہمارا جہاد یہ ہے کہ خدا کے عذاب سے دور بھاگنے کے لیے اپنی ساری کوشش صرف کر دیں۔ مومن کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ حالات کے مطابق لوگوں کو ان کی دنیوی مشکلات سے نکلنے میں مدد دے۔ مگر زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ دنیوی مشکلات سے نجات پانا نہیں ہے بلکہ آخرت کے عذاب سے نجات پانا ہے۔ مومن کا اصل کام یہ ہے کہ اپنی کوششوں کو اس راہ میں صرف کرے۔ لوگوں کو جہنم سے بچانے کے لئے وہ اپنی ساری طاقت لگا دے۔

یہ دعوتی جدوجہد اور خدا کی راہ میں آخری حد تک بڑھنے کی اسی کوشش کا نام جہاد ہے جس کو حدیث میں دین کی سب سے بلند چوٹی کہا گیا ہے۔ جہاد اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ہے کہ بندے کے لیے ایک ایسا میدان فراہم کیا جائے جہاں وہ اپنی تمام کوششوں کو خدا کی راہ میں لگا سکے۔ جہاد کی روح یہ ہے کہ بندہ اپنی کوششوں کو آخری حد تک صرف کر ڈالے تاکہ خدا اپنی رحمتوں کو اس کے اوپر آخری حد تک نڈھالے جہاں تکلیفوں اور دشواریوں کے میدان میں اپنے خدا پرست ہونے کا ثبوت دینا ہے۔ آدمی اکثر اپنی کوتاہیوں کے جواب میں دشواریوں کی ایک فہرست پیش کرتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ بھی دشواریاں وہ نعمتی مواقع ہیں جن کے خلاف جدوجہد کر کے آپ اپنے رب کو خوش کر سکتے ہیں۔ آپ جن ذاتی مسائل کی بنا پر اسلام کی طرف بڑھنے سے رک رہے ہیں، وہ دراصل آپ کے لیے ترقی کے ذریعے ہیں۔ یہ اس لیے نہیں ہیں کہ آپ ان کو دیکھ کر رک جائیں۔ وہ اس لیے ہیں تاکہ آپ انہیں بھانڈ کر آگے بڑھ جائیں۔ خدا کے نزدیک اس کا سب سے محبوب بندہ وہ ہے جو اپنی تنازوں کو اس کے لیے دین کر دے، جو اپنے آرام کو اس کی خاطر چھوڑ دے، جو اپنی مشکلات کو نظر انداز کر کے اس کی طرف چلا آئے۔ دنیا میں کسی شخص کی کامیابی یہ نہیں ہے کہ وہ یہاں کچھ حاصل کر لے۔ کامیاب دراصل وہ ہے جو خدا کی راہ میں اپنا سب کچھ ٹاڈے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے پوچھا: سب سے افضل جہاد کون سا ہے؟ آپ نے فرمایا: "وہ شخص جو اپنی بہترین سواری لے کر نکلا اور میدان جنگ میں اس کا گھوڑا مارا گیا اور وہ خود بھی شہید ہو گیا۔" گویا سب سے زیادہ خوش نصیب وہ شخص ہے جو بالکل ٹا ہوا اپنے رب کے پاس پہنچے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمتوں کو اس کے اوپر انڈیل دے گا۔

محترم زقار، یہ اجتماع میں جس آپ اس وقت شریک ہو رہے ہیں اس کی بہترین تعمیر میرے نزدیک یہ ہے کہ یہ آپ کی طرف سے تجدید عہد ہے۔ آپ نے جماعت میں شریک ہو کر پہلے دن اپنے رب سے جو معاہدہ کیا تھا، یہ اس معاہدہ پر آئندہ قائم رہنے کا عزم ہے جو آپ اپنے میکڑوں زقار کے سامنے کر رہے ہیں اور جس پر خدا اور اس کے فرشتے گواہ ہیں۔ اگر کھلی مدت میں آپ اپنے معاہدے کو پورا کرنے والے ثابت ہوئے ہوں، اگر آپ کے دن اور آپ کی راتیں اس بات کی شہادت دیتی ہوں کہ آپ اپنے معاہدے میں پورے اترے ہیں تو میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ اس تجدید عہد کا موقع ملنا آپ کے لیے آپ کے رب کی طرف سے خوش خبری ہے۔ یہ آپ کی کوششوں کے قبول کیے جانے کا نشان ہے اور اگر آپ اپنے معاہدے کو پورا کرنے میں کوتاہ ثابت ہوئے ہوں تو اسی صورت میں آپ کو یہاں آنے کی توفیق دینے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو اس بات کا ایک اور موقع دیا گیا ہے کہ آپ اپنے معاہدے کی اہمیت کو کھیں اور جو کچھ پہلے نہیں کر سکتے اس کو آئندہ کسے کا عزم لے کر یہاں سے واپس جائیں۔

آپ جانتے ہیں کہ ہم جو کچھ کر سکتے ہیں اپنی موجودہ زندگی ہی میں کر سکتے ہیں اور اس زندگی کی مدت

بہت کم ہے۔ کتنے لوگ ہیں جن کو ہم نے اپنی آٹھوں سے دیکھا تھا مگر آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ اسی طرح جو لوگ، آج ہمیں دیکھ رہے ہیں ایک وقت آئے گا کہ ہم ان کو دیکھنے کے لیے اس دنیا میں موجود نہ ہوں گے۔ ہم اپنی عمر پوری کر کے اپنے رب کے پاس جا چکے ہوں گے۔ ہماری موجودہ زندگی وہ پہلا اور آخری لمحہ ہے جب کہ انسان اپنے مستقبل کی تفریح کے لیے کچھ کر سکتا ہے۔ خاص سے پہلے ایسا کوئی موقع انسان کو ملا تھا اور نہ اس کے بعد ایسا کوئی موقع انسان کو ملے گا۔ ہم ایک ایسے امتحان سے گزر رہے ہیں جس کا ایک لازمی نتیجہ ہمارے سامنے آنے والا ہے اور بہت جلد ہم ایک ایسے لازمی نتیجے سے دوچار ہوں گے جس کے بعد پھر کسی تیاری کا موقع ہم کو نہیں ملے گا۔ زندگی کا ہر لمحہ جو آپ صرف کر رہے ہیں، خوب سمجھ لیجیے کہ آخری طور پر صرف کر رہے ہیں۔ کیونکہ وہ پھر واپس آنے والا نہیں ہے۔

خدا کا دین ہم سے ہماری زندگی مانگ رہا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ ہم اپنا پورا وجود اس کے سپرد کر دیں۔ ہمارے دن اور ہماری راتیں اس کے لیے وقف ہو جائیں اپنی طاقت کا آخری حصہ تک ہم اس کی راہ میں لگا دیں۔ جو لوگ اس سبز و شادمانہ جذبے کے ساتھ آگے بڑھیں اور جن کے اندر اپنے آپ کو قربان کر کے دین کی خدمت کرنے کا حوصلہ ہو، وہی دراصل دین کی خدمت کریں گے اور جن کے اندر یہ حوصلہ نہ ہو۔ وہ صرف اپنی خدمت کر سکتے ہیں۔ خدا کے دین کو ایسے لوگوں کی ضرورت نہیں۔ رہا ہمارا زندگی رام پور جب ۱۳۸۰ھ

نوٹ: جماعت اسلامی کے کل ہند اجتماع بمقام دہلی میں کی گئی ایک تقریر، ۱۲ نومبر ۱۹۶۰ء

## بامقصد زندگی

دوستو! ہم مسلمان ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے بارے میں دعویٰ رکھتے ہیں کہ ہم بامقصد لوگ ہیں۔ کیوں کہ اسلام زندگی کا ایک مقصد ہے۔ مگر میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ بامقصد ہونے کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ ایک مقصدی تصور آپ کے ذہن میں پایا جا رہا ہو۔ کچھ تقریروں کو سن کر یا کچھ تحریروں کو دیکھ کر ایک مقصدی نظر یہی کیے داغ میں پونچ جاتے تو صرف اس بنا پر اسکو بامقصد انسان نہیں کہا جاسکتا۔ بامقصد انسان تو وہی ہے جو اپنے پورے وجود کے ساتھ بامقصد بن گیا ہو جس کی زندگی اس کے مقصد میں اس طرح ڈھل جاتے کہ دونوں کے درمیان کوئی دوئی باقی نہ رہے۔

آپ اس وقت ایک سب میں بیٹھے ہیں جس کے اوپر اونچے اونچے مینار کھڑے ہیں اگر ہوا کے ذریعے کچھ آم کے پتے اڑ کر آئیں اور ان میناروں پر ایک جائیں تو اس بنا پر ان میناروں کو آپ آم کا درخت نہیں کہنے لگیں گے۔ آم کا درخت تو وہی ہے جو اپنی جڑ میں بھی آم ہو، اپنے تنہ میں بھی آم ہو، اپنی شاخوں میں بھی آم ہو، اپنے پتوں میں بھی آم ہو، اور وہ آم ہی کے پھل دے۔ آم کا درخت آپ اسی کو کہتے ہیں جو اس طرح اوپر سے نیچے تک آم ہو محض کسی لمبی کھڑی ہوئی چیمیز پر آم سے مشابہت رکھنے والی کچھ چیزوں کا اتنا ہی سے جمع ہو جانا اس کو ہرگز آم نہیں بنا دیتا۔ اسی طرح آپ کو بھی بامقصد انسان کا لقب اسی وقت دیا جاسکتا ہے جب آپ سر سے پاؤں تک اپنے پورے وجود میں بامقصد بن گئے ہوں۔ محض کچھ نظر پر لکھیں سے آکر آپ کے ذہن میں ایک جانا آپ کو بامقصد نہیں بنا دیتا۔ اسلام زندگی کا ایک مقصد ہے اور ہم اسی وقت مسلمان کہے جانے کے مستحق ہیں جب ہم نے واقعی ایک مقصد کی طرح اسلام کو اپنی زندگی میں شامل کیا ہو۔

بامقصد انسان کی پہچان کیا ہے۔ اس کو درجنوں پر ایہ سے بیان کیا جاسکتا ہے اس وقت میں اسکی چند خصوصیات کا مختصر طور پر ذکر کرونگا۔

۱۔ با مقصد آدمی کی پہلی پہچان وہ ہے جس کو میں ”ارمکار“ کے لفظ سے تعبیر کروں گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی تمام فکری اور ذہنی قوتیں آپ کے مقصد میں مرکوز ہو جائیں۔ آپ کا سوچنا، آپ کا محبت کرنا، آپ کا نفرت کرنا، سب کچھ آپ کے مقصد کے ساتھ وابستہ ہونگے ہوں۔ آپ کی کوئی چیز دوسری سمت بکھری ہوئی نہ ہو۔ جو بنانے والوں کے یہاں آپ نے دیکھا ہو گا، کام کرتے کرتے ان کے پاس بہت سی کیلیں پھیل جاتی ہیں۔ اس وقت وہ یہ کرتے ہیں کہ مقناطیس کا ایک ٹکڑا لے کر وہاں پھراتے ہیں جس سے تمام بھری ہوئی کیلیں مٹنے لگیں اور اس سے چٹ جاتی ہیں۔ اور پھر وہ اٹھا کر اسے خانے میں رکھ لیتے ہیں۔ اس مثال میں اگر مقناطیس کی جگہ آپ اپنے مقصد کو ٹھیں اور کیلیوں کے بجائے اپنے افکار و خیالات اور جذبات و احساسات کا تصور کریں تو زندگی اور مقصد کے درمیان تعلق کو آپ سمجھ سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مقناطیس کے گرد لوہے کے ٹکڑے جس طرح ایک ایک کر کے اکٹھا ہوتے ہیں اور اس پاس کا کوئی ٹکڑا ایسا نہیں ہوتا جو اس سے آکر چٹ نہ گیا ہو، اسی طرح آدمی کے مقصد کے گرد اس کے سارے دل اور سارے دماغ کو مرکوز ہو جانا چاہیے۔

یہاں ایک واقعہ مجھے یاد آتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک صاحب میسرے یہاں آئے ان کو بازار کا کچھ کام تھا۔ بازار جا کر جب وہ لوٹے تو انھوں نے ایک واقعہ بتایا جس سے مجھے بڑی عبرت ہوئی۔ واقعہ بہت چھوٹا سا ہے مگر اس میں ہمارے لئے بڑی نصیحت ہے، انھوں نے کہا کہ میں ایک جگہ پہنچا جہاں سڑک کے کنارے بہت سے موچی اپنی اپنی دوکان لئے بیٹھے تھے۔ جب میں اُنکے پاس سے گذرا تو میں نے دیکھا کہ ان میں سے ہر شخص میرے جوتے کی طرف دیکھ رہا ہے۔ جس موچی کی نظر اٹھتی ہے وہ بس میرے جوتے پر آکر رک جاتی ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ موچی بھی اپنے مقصد میں کس قدر گم ہیں۔ ان کو انسان صرف جوتے کی شکل میں نظر آتا ہے پھر ہونے بازار میں سینکڑوں انسان ان کے سامنے سے آتے جاتے ہیں۔ مگر انھیں ان انسانوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ ان کو نظر اٹھا کر دیکھے ہی نہیں۔ وہ صرف یہ جانتے ہیں کہ یہ آئے جانے والے لوگ اپنے پاؤں میں ایک ایسی چیز پہننے ہوئے ہیں جس کی پائنتی کر کے یا جس کی مرمت کر کے وہ کچھ پیسے حاصل کر سکتے ہیں۔ تو انسان ان کی نظر میں صرف ایک جوتا ہے اور میں۔ اسی طرح با مقصد آدمی اپنے مقصد میں گم رہتا ہے۔ اس کو ہر چیز میں صرف اپنا مقصد نظر آتا ہے۔ وہ ہر واقعہ کو، ہر مسئلہ کو، ہر بات کو اپنے مقصد کی روشنی میں دیکھتا ہے حتیٰ کہ وہ اپنے مقصد کے تصور میں اتنا محو ہو جاتا ہے کہ دوسری چیزیں اسے بھولنے لگتی ہیں۔ ایک صاحب ہیں جو بہت نفع سال آدمی ہیں جو کام بھی کرتے ہیں اس کو پوری طرح لگ کر کرتے ہیں ایک مرتبہ

میں ایک ایسے زمانے میں ان سے ملنے گیا جب وہ اپنا نیا مکان بنوانے میں مصروف تھے۔ میں نے دیکھا کہ ان کے ہاتھوں میں ایک جگہ ہتھکے لال لال دھبے پڑے ہوئے ہیں۔ پوچھا یہ کیا ہے۔ انہوں نے دیکھ کر کہا، مجھے خود بھی نہیں معلوم۔ اس کے بعد انہوں نے ہاتھوں کو اٹھایا تو معلوم ہوا کہ کسی سخت چیز سے ٹکرانے کی وجہ سے ٹانگ میں ایک جگہ چوٹ لگ گئی ہے۔ چوٹ لگ کر خون بہا، کپڑے میں لگا، پھر خود بخود سوکھ کر بند ہو گیا۔ اور انھیں مطلقاً خبر نہیں ہوئی۔ جب آدمی کے سامنے کوئی مقصد ہو تو وہ اسی طرح اس میں منہمک ہو جاتا ہے۔ اس وقت وہ ایک اور ہی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں دوسری چیزیں اس کے ساتھ چھوڑ دیتی ہیں۔ جہاں دوسری چیزیں اسے محسوس نہیں ہوتیں۔ حتیٰ کہ خود اپنی ذات کے جسمانی تقاضے بھی بعض اوقات اسے یاد نہیں رہتے۔

یہاں وہ بات ہے جس کو میں نے "ارتکاز" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ با مقصد آدمی وہی ہے جس کو اپنے مقصد میں اس درجہ شغف اور انہماک ہو جائے۔ اس کے بغیر اپنے آپ کو با مقصد آدمیوں کی فہم میں رکھنا، مقصد کے لفظ سے ایک طرح کا مذاق کرنا ہے۔

۲۔ با مقصد آدمی کی دوسری پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے مقصد کے مطابق زندگی گزارتا ہو۔ مقصد کے مطابق عمل سے میں ایک خاص چیز مراد لے رہا ہوں جس کو آپ ایک مثال سے سمجھ سکتے ہیں۔ ایک حکیم صاحب ہیں جو ایک دیہات میں دوا علاج کا کام کرتے ہیں وہ کوئی سندھیا فیتھلیب نہیں ہیں نہ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ بس لوگوں کی صحبت اور تجربہ کی وجہ سے کچھ باتیں جان گئے ہیں اور اس کے مطابق کام کر رہے بلکہ اپنی محنت اور توجہ کی وجہ سے اپنے علاقہ میں اچھے خاصے متعارف بھی ہو گئے ہیں۔ ان کے گھر پر کچھ کھیتی باڑی کا کام بھی ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ انہوں نے کہا کہ میں کھیتی کے موٹے کام مثلاً کھوڑنا، ہل چلانا وغیرہ اپنے ہاتھ سے نہیں کرتا۔ آپ سمجھیں گے وہ شاید کوئی شہروانی پوش آدمی ہونگے اور اپنی شہروانی کی عزت رکھنے کے لئے ایسے کاموں سے بچتے ہوں گے مگر ان کو شہروانی اور شہروانی کی زندگی سے کوئی دل چسپی نہیں۔ وہ بالکل سیدھے سادے دیہاتی حکیم ہیں۔ کھیتی کے سمٹ کاموں سے الگ رہنے کی وجہ انہوں نے یہ بتائی کہ اگر میں اس طرح کے کام کروں تو میرا ہاتھ سخت ہو جائے گا۔ انگلیوں کی کھال موٹی ہو جائے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ مریض کی نبض میں ٹھیک طرح سے دیکھ نہ سکوں گا۔ نبض کی ضربیں ہلکی ہوتی ہیں اور ان میں بہت نازک اور لطیف فرق ہوتے ہیں۔ ان کو محسوس کرنے کے لئے انگلیوں کا نرم ہونا بہت ضروری ہے۔ اگر انگلیاں ہل اور کدال پکڑتے پکڑتے سخت ہو جائیں، جیسا کہ اس طرح کا کام کرنے والوں کی ہوتی ہے، تو وہ نبض کی ضربیں محسوس کرنے کے قابل نہیں رہیں گی۔

ہر مقصد اپنے اختیار کرنے والے سے کسی کا تقاضہ کرتا ہے۔ جو شخص بھی کسی مقصد کو

ایسائے، ضروری ہے کہ وہ اپنی عملی زندگی اور اپنی روزانہ کی سرگرمیوں کو اپنے مقصد کے ساتھ ہم آہنگ رکھے۔ وہ دونوں میں کوئی تضاد پیدا نہ ہونے دے۔ با مقصد آدمی ایک با شعور آدمی ہوتا ہے۔ اگر اس کے اندر حقیقتاً ایک مقصد اثر اہولہ ہے، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو ایسے عملی حالات اور ایسے مشاغل کی طرف نہ لے جائے جہاں وہ اور اس کا مقصد الگ الگ ہو جائیں۔ جب وہ ویسا بن کر نہ رہ سکے جیسا اپنے مقصد کے اعتبار سے اسے بن کر رہنا چاہیے۔

میں ایک ایسے مسلم خاندان کو جانتا ہوں جس کی آمدنی اتنی تھی کہ وہ معقول طریقے سے ایک سادہ زندگی گذار رہا تھا اور اسی کے ساتھ دین کے تقاضے بھی پورے کر رہا تھا۔ اس کے بعد اس کے یہاں ایک لڑکی اور ایک لڑکے کی شادی ہوئی۔ اس کے مقصد کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ شادی کو اس طرح کرے کہ اس کی وجہ سے اس کے گھر میں معمول کے مطابق زندگی چل رہی ہے اس میں کوئی خلل پیدا نہ ہو۔ مگر اس نے پہلی غلطی یہ کی کہ شادی کے لئے ایک ایسے خاندان کا انتخاب کیا جس کا معیار زندگی اس کے مقابلے میں بڑھا ہوا تھا۔ پھر شادی بھی اس طرح کی جیسے عام دنیا دار لوگ اپنی شادیاں کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف اس کے گھر کا سارا سرمایہ شادی میں لگ گیا بلکہ وہ کافی مقررہ بھی ہو گیا۔ اس کے پیچھے اس کا سارا کاروبار اجڑ گیا۔ اگر صرف اتنا ہی نقصان ہوا ہوتا جب بھی قیمت تھا، کیوں کہ جس طرح مختلف قسم کے دستی مادے آدمی کے اوپر پڑتے ہیں اور پھر وہ سنبھل جاتا ہے، اسی طرح وہ دوبارہ سنبھل جاتا۔ مگر شادی نے اس کو ایک نئی مصیبت میں ڈال دیا۔ جس کا پہلے اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اپنی لڑکی کو اس نے جو کپڑے اور سامان دیئے اور سسرال سے اس کے لئے جو کپڑے وغیرہ آئے، اس کی وجہ سے شادی شدہ لڑکی کی پوشش اور رہن سہن کا معیار یکا یکا بہت بڑھ گیا۔ اور جب گھر کی ایک لڑکی کا معیار بڑھا تو اسی کیساتھ دوسروں کا لحاظ کرنا ضروری تھا۔ پھر اسی کے ساتھ نئے نئے فرنیچر سے لدی ہوئی پوری ایک گاڑی بھی اس کے گھر آئی ان چیزوں کے نتیجے میں اس کی گھریلو زندگی کا معیار بالکل مصنوعی طور پر یکا یک بدل گیا۔ اب ہر چیز میں پہلے سے زیادہ خرچ ہونے لگا۔ اس طرح ایک طرف پچھلے قرضوں کی ادائیگی اور دوسری طرف بڑھتے ہوئے اخراجات کو پورا کرنا، ایسے دو پاٹ بن گئے جن کے نیچے اس کی زندگی پس کر رہ گئی، اس کا گھر دیکھتے دیکھتے یک دینہ اور گھرانے سے ایک دنیا دار گھرانے میں تبدیل ہو گیا۔

یہ صرف ایک واقعہ نہیں ہے۔ بلکہ میں نے کتنے لوگوں کو دیکھا ہے کہ اسی طرح وہ اپنے دنیوی معاملات میں ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں کہ بالآخر وہ انہیں گھسیٹ کر تباہی کے غار میں پھونچا دیتا

ہے۔ جو شخص کسی مقصد کے لئے دنیا میں جینا چاہتا ہو، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ باشعور زندگی گزارے۔ وہ اپنی سرگرمیوں پر نظر رکھے۔ اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو اس مادی دنیا میں ہر وقت اس کا اسکان ہے کہ آدمی ایسے بندھنوں میں اپنے آپ کو پھنسا لے جس کے بعد وہ بہ ظاہر زندہ نظر آتا ہو، مگر مقصد کے اعتبار سے اس نے خود کٹی گری ہو۔ دنیا کی ناشکی چیزوں میں دل سپی مادی ساز و سامان کی کثرت، سطحی مشاغل میں پڑنا، غیر ضروری عادتوں میں اپنے کو ڈالنا، پست لٹریچر کا مطالعہ۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو آدمی کو مقصد سے دور کر دیتی ہیں، اس کے وقت کو غیر ضروری مشغولیتوں میں لگا دیتی ہیں، اس کے جذبات و احساسات کو مقصد کے باہر سے میں کر دے دے دوسری چیزوں کے بارے میں شدید کر دیتی ہیں۔ اس کو ایسے تعلقات اور ایسے تقاضوں میں الجھا دیتی ہیں کہ وہ نہ چاہنے کے باوجود دوسری طرف کھینچا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ اپنے مقصد سے دور ہو جاتا ہے۔

اگر آپ کو اسلام عزیز ہے اور آپ اس کو اپنا مقصد بنا کر اسی کے لئے جینا اور اسی کے لئے مرنے چاہتے ہیں تو آپ کے لئے لازم ہے کہ اپنی عملی زندگی، اپنے تعلقات اور اپنی روزانہ کی مصروفیتوں کو اس سے ہم آہنگ رکھیں، آپ دونوں میں کوئی تضاد پیدا نہ ہونے دیں۔ اس معاملے میں آپ کو اس ہوشیار طبیب کی طرح بن جانا چاہیے جو اپنی آنکھوں تک اس کی حیثیت سے حفاظت کرتا ہے کہ وہ ایسے حالات سے دوچار نہ ہوں کہ وہ نبض دیکھنے کی صلاحیت کو کھو دیں پھر ایک مسلمان کا مقصد اس سے زیادہ نازک اور اس سے زیادہ مشکل ہے، اس لئے آپ کو اس سے زیادہ ہوشیاری کے ساتھ اپنی حرکات پر نظر رکھنی چاہیے۔

۲- تیسری چیز با مقصد آدمی کو پہچاننے کی یہ ہے کہ اس کے عمل میں مقصد کی ریح موجود ہو۔ یہاں "عمل" سے میری مراد عام عمل نہیں ہے، بلکہ وہ عمل ہے جو مقصد کے تعلق سے ظاہر ہوتا ہے۔ آپ تعجب نہ کریں۔ مقصد سے متعلق عمل بھی کبھی بے مقصد ہوتا ہے۔ یہ ظاہر آدمی مقصد کا سائل کر رہا ہوتا ہے، مگر حقیقتاً اس کے عمل کا مقصد سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

ایک مثال لیجئے۔ ہمارے یہاں جو مذہبی فریقے ہیں ان کی ابتدا بھی اصلاً ایک مقصدی گروہ کی حیثیت سے ہوتی تھی۔ وہ ایک مخصوص مشن لے کر اٹھے تھے مگر ہر شخص جانتا ہے کہ آج وہ اپنی مقصدی حیثیت کو کھو چکے ہیں۔ وہ تحریک کے بجائے ایک جاہل قوم کی روایتی انجمن بن کر رہ گئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کا مقصدی تصور ان کے ذہن سے نکل گیا، اور نہ ایسا ہے کہ مقصد کے لئے کام کرنا انہوں نے چھوڑ دیا ہے۔ یہ سب چیزیں آج بھی کسی نہ کسی شکل میں ان کے اندر پائی جاتی ہیں۔ مگر ان میں اب وہ اسپرٹ باقی نہیں رہی جو ایک مشن کے علم بردار کے اندر ہوتی ہے۔

اب ان کا مقصد محض ایک بحث و گفتگو کا موضوع ہے جس پر وہ کبھی آپس میں کبھی دوسروں سے باتیں کر لیتے ہیں۔ ان کے رسالے اور اخبار نکلتے ہیں۔ مگر ان رسالوں اور اخباروں کی حیثیت مقصدی پرچوں سے زیادہ کاروباری اداروں کی ہے۔ ان کے اجتماعات بھی ہوتے ہیں۔ مگر ان اجتماعات کی حیثیت کسی مقصدی سرگرمی کی نہیں۔ بلکہ وہ ماضی کی ٹپری ہونی ایک ٹیکر ہے جس پر وہ رسمی طور پر چلے جا رہے ہیں۔ ان کے جماعتی فنڈ بھی ہیں جن میں وہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ دیتے ہیں۔ مگر یہ دنیا زیادہ تر جماعتی تقاضے کے تحت ہوتا ہے نہ کہ حقیقتہً انصاف فی سبیل اللہ کے جذبے کے تحت۔ وہ اپنے خیالات کو پھیلانے کے لئے دور سے دور تفریریں کرتے ہیں۔ مگر یہ سب کسی مقصدی بے تابی کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ بلکہ یا تو محض روایتی ذوق کا اظہار ہوتا ہے یا اسکی قسم کے جذبے کے تحت ہوتا ہے جیسے کسی فرم کی سبستی برانچ کا انفرینٹی ڈیویڈنڈ انجام دینے کے لئے کیا کرتا ہے۔ وہ اپنے مخصوص موضوعات پر کتابیں اور مفلٹس چھاپتے ہیں۔ مگر اس کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی کہ ایک بنے ہوئے حلقہ کی مانگ پوری کر دی جائے۔

دوسرے جو حقیقتہً داعیانہ جذبے کے تحت نکلتا ہے اور وہ عمل جو روایتی طور پر یا محض ڈیویڈنڈ انجام دینے کے لئے کیا جاتا ہے، دونوں میں بڑا فرق ہے۔ ایک حقیقت ہے اور دوسرا حقیقت کی نقل۔ ایک جگہ بات صرف حلق سے نکلتی ہے اور دوسری صورت میں آدمی جب بولتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے کلام میں اپنی پوری شخصیت کو اندیل دیا ہے۔ ایک صورت میں آدمی کا عمل صرف ایک لگی بندھی کارروائی نظر آتا ہے، اور دوسری صورت میں اس کا عمل اس کے بے تاب جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک صورت میں آدمی کی تمام زندگی سراپا اس کے مقصد میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے اور دوسری صورت میں بعض مقصد سنا اجزاء اس کی غیر متعلق زندگی کے ساتھ اس طرح ادھر ادھر اٹکے ہوئے ہوتے ہیں جیسے کسی مینار میں آم کے چند پتے۔

یہ خطہ ہر اس گروہ کو ہے جو ایک مقصد کو لیکر اٹھے اور اس پر اس کو پچیس پچاس سال گذر جائیں۔ لیکن یاد رکھئے کوئی گروہ اسی وقت تک مقصدی گروہ ہے جب تک حقیقتہً وہ مقصدی تڑپ کے تحت کام کر رہا ہو۔ اس کے بعد جب اس کی گاڑی اس سے اتر کر روایتی ڈگر پر چل پڑے، جب اس کی سرگرمیاں بے تابانہ جذبات کے اظہار کے بجائے مقررہ کارروائی بن کر رہ جائیں، تو وہ تحریک کے بجائے رزم اور جماعت کے بجائے انجمن بن جاتی ہے۔ اس کے بعد بھی اگر ہر شکلہً وہ ایک با مقصد گروہ کے مانند نظر آتا ہے۔ مگر مقصدی حیثیت سے اب اس پر موت وارد ہو چکی ہوتی ہے۔

وہ با مقصد انسان نہیں ہوتا۔ بلکہ سابقہ با مقصد انسان کی لاش ہوتی ہے جو دیکھنے میں سابقہ انسان کی طرح نظر آتی ہے، مگر حقیقتہً انسان نہیں ہوتی۔ اللہ کو جو چیز مطلوب ہے وہ کوئی رسمی ڈھانچہ یا کوئی تنظیمی کارگزاری نہیں ہے۔ ایسے ڈھانچہ یا کارگزاری کا نمونہ تو مشینی انسان بھی پیش کر سکتے ہیں۔ اللہ کو ہمارے زندہ شعور اور ہمارے بیدار ارادہ کا اندازہ مطلوب ہے۔ اللہ کو ہمارے عمل کا تقویٰ پہنچانے نہ کہ عمل کے ظاہری ہنگامے، عمل کے دوران ہم اپنے شعور کو جس طرح متحرک کرتے ہیں، ہماری نفسیات میں جو اندرونی پھیل پیدا ہوتی ہے، عمل کرتے ہوئے ہمارے قلب و روح کو جو حیاتیاتی غذا ملتی ہے وہی ہمارا اصل حاصل ہے۔ جب مقصدیت زندہ ہو تو آدمی کا عمل ایک زندہ عمل ہوتا ہے اور جب مقصدیت مرجاتی ہے تو عمل ایک بے روح کارروائی بن کر رہ جاتا ہے۔ آدمی حرکت کرتا ہے مگر اس کی روح پر محمود طاری رہتا ہے۔ آدمی ظاہری کارنامے دکھاتا ہے مگر آدمی کا اندرونی وجود اس طرح سویا رہتا ہے جیسے اس پر نیند طاری ہو گئی ہو۔ آدمی اوپر سے زندہ دکھائی دیتا ہے مگر اندر سے وہ ایک مڑا ہوا انسان ہوتا ہے۔

اب میں ایک آخری بات کہہ کر اپنی گفتگو کو ختم کروں گا۔ اس طرح کی باتیں جب کہی جاتی ہیں تو بعض لوگ جواب دیتے ہیں۔ ”آپ کی باتیں تو سب ٹھیک ہیں، ہم خود بھی اپنے اندر یہی چیزیں پا کر ناچاہتے ہیں، مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ چیزیں کیسے پیدا ہو۔“ یہ بظاہر ایک سوال ہے مگر حقیقتہً اس کے ذریعے سے اپنے الزام کو اپنے سے ہٹانے کے لئے اسے خارج کے اوپر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر سوچئے کہ وہ خارج جس کے اوپر آپ اپنا الزام ڈالنا چاہتے ہیں وہ کونسا ظاہر ہے کہ وہ اس دنیا کا مالک خدا ہے۔ اسی نے ساری چیزوں کو بنایا ہے۔ اس نے خارج کو الزام دینے کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے یہ دنیا اس ڈھنگ سے بنائی ہے کہ ہم وہاں اپنے ایمانی تقاضوں کو حاصل کرنا چاہیں تو مجال نہ کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ یہ باطل غلط بات ہے۔ خدا ص سے پاک ہے کہ اس پر یا اس کی تخلیق پر اس قسم کا الزام عائد ہو سکے۔ اس لئے خارج پر جب الزام ڈالنا نہیں جا سکتا تو لامحالہ وہ آپ کی طرف لوٹے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری انہی ذات کے سوا اور کوئی نہیں ہے جو ہماری ترقی کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے والا ہو۔ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ فطرت اور حقیقت میں تضاد نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ حقیقت ہے کہ ہم کو ایسا ہی بننا چاہئے تو لازماً ہماری فطرت اور کائنات کو ایسا ہونا چاہئے کہ ہم ایسے بن سکیں۔

اس لئے ہر خرابی کا سبب اپنے اندر ڈھونڈئے کیوں کہ آپ کے باہر حقیقت کوئی چیز نہ ہی نہیں ہے جہاں یہ اسباب پائے جا رہے ہوں۔ (الفرقان محم ۱۳۸۴ھ)

(جماعت اسلامی ضلع اعظم گڑھ کے ایک اجتماع میں کی گئی تقریر۔ ۱۹۶۳ء)

## یہ بے حسی کیوں

مجھ کو جب یہ حکم ملا کہ اس وقت کی مجلس میں مجھے کچھ کہنا ہے، تو میں نے سوچنا شروع کیا کہ وہ کیا بات ہے جو مجھے آپ سے کہنی چاہئے۔ یہ چونکہ نصیحت، یا قرآن کے الفاظ میں کوئی خاصی بات تھی اور تو اسی بالصبر کی مجلس ہے، اس لئے اس مناسبت سے بہت سی باتیں ذہن میں آئیں۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک سوال نے میرے سلسلہ خیال کو توڑ دیا۔ ”تم جو باتیں سوچ رہے ہو کیا وہ سننے والوں کے لئے نئی ہیں، کیا ان کے کان بار بار یہ دوازیں نہیں ہی چکے ہیں۔ پھر جن الفاظ نے اس سے پہلے کوئی اثر نہیں دکھایا، وہی الفاظ ایک مرتبہ اور دہرانے سے کیا انقلاب آجائے گا؟ اس سوال کا آنا تھا کہ میرے سارے خیالات اس طرح منتشر ہو گئے جیسے یکایک ہوا کا تیز چھونکا آئے اور تنکوں اور پتوں کے ڈھیر کو اڑانے لگے۔“

اب میں دم بخود تھا۔ ”آخر اس بے حسی کی وجہ کیا ہے“ یہ سوال میرے سامنے گھومنے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے ساری باتیں کہہ ڈالی ہیں اور اب میرے پاس آپ سے کہنے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ میری مثال اس مقرر کی سی ہو گئی جو اپنی پوری تقریر ختم کر چکا ہو۔ مگر ساری قوت صرف کرنے کے بعد آخر میں جب وہ حاضرین سے کہے کہ لگائیے نوره ”انقلاب زندہ باد“، تو سامنے بیٹھے ہوئے ہزاروں انسانوں میں سے کسی ایک کی زبان بھی حرکت میں نہ آئے۔ وہ بار بار کہنے لگے کہ ”لگائیے نوره“ مگر شخص اس طرح خاموش بیٹھا رہے گویا کسی کے منہ میں زبان ہی نہیں ہے۔ عین اس وقت مجھے دوسرے ایک آواز سنائی دی۔ مجھے نظر آیا کہ امام ترمذی سے لے کر کعب بن عیاض تک انسانوں کی ایک جماعت ایک دوسرے کو پکار رہی ہے کہ آخری رسول کا یہ پیغام اس بندۂ خدا تک پہنچا دو، کیوں کہ اس کی پیغام میں اس کے سوال کا جواب ہے:

حد ثنا احمد بن منیع قال سمعت ابن سوار ثنا	امام ترمذی سے کہا احمد بن منیع نے، ان سے کہا حسن بن سوار
لیث بن سعد عن معاوية بن صالح عن عبد	نے، ان سے کہا لیث بن سعد نے، ان سے کہا معاویہ بن
الرحمن بن جبیر بن نقیر حد ثنا عن ابیہ عن	صالح نے، ان سے کہا عبدالرحمن بن جبیر نے، ان سے کہا
کعب بن عیاض قال سمعت النبی صلی اللہ علیہ	ان کے پاپ نے، ان سے بیان کیا کعب بن عیاض نے،
وسلم یقول: ان لكل امة فتنة وفتنة امتی	انہوں نے کہا کہ میں نے سنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے،
(المال ترمذی، ابواب الزہد)	آپ نے فرمایا۔ ہر امت کا ایک فتنہ تھا اور میری امت
	کے لئے جو چیز فتنہ بنے گی وہ مال ہے۔

اس فقرے میں ”مال“ دراصل ”دنیا“ کا قائم مقام ہے۔ کیوں کہ دنیا کی وہ تمام چیزیں جن کو عاجلہ پسند انسان لپھائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے وہ مال ہی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں۔ مال دنیا کے ساز و سامان کی قیمت ہے۔ جیسا کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے، یہی دنیا ہر زمانے میں انسانوں کی گمراہی کا سبب رہی ہے۔ مگر بعد کے دور

میں یہ فتنہ پوری شدت سے ظاہر ہونے والا تھا۔ اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو خاص طور پر امت اسلامیہ کا فتنہ قرار دیا۔ پہلے آدمی جن لڈاؤں کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا وہ آج سائنسی تحقیقات کے نتیجے میں واقعہ بن کر انسان کو حاصل ہو چکی ہیں۔ یہی نہیں، پہلے دنیا کی جو رنگینیاں اور اس کے دل کش ساز و سامان صرف کسی بادشاہ کے محل میں ہوتے تھے، وہ آج خوب صورت الماریوں میں سجے ہوئے بازار کے اندر نظر آتے ہیں، وہ آج در و دیوار پر رنگین استہارات کی صورت میں لگے ہوئے ہیں، وہ پوری رعنائی کے ساتھ ٹرکوں پر ظاہر ہو کر ہر راہ گیر کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا اس سے پہلے کبھی اتنی حسین نہیں تھی، اس لئے وہ اس سے پہلے انسان کے لئے اتنا بڑا فتنہ بھی نہیں بن سکتی تھی۔

یہاں میں ایک واقعہ کا ذکر کروں گا جو ابھی حال میں اخبارات میں آیا تھا۔ نئی دہلی میں ہندوستان کے بین الاقوامی صنعتی میلے میں امریکہ کی طرف سے ایک ہوائی موٹر کار کی نمائش کی گئی ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ زمین پر بھی چلتی ہے اور ساتھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ہوا میں بھی اڑ سکتی ہے۔ اس عجیب و غریب کار کو جب ایک نوجوان سادھو نے دیکھا تو اس کے سامنے ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا "کیا میں تیاگ اور قربانی کی زندگی کو چھوڑ کر مادی ترقی کی دنیا میں اپنے حوصلوں کی تسکین ڈھونڈوں" سادھو نے کہا۔ گہرے کپڑے میں لبوس اور لمبے بھڑے ہوئے بالوں والا یہ ہندوستانی نوجوان میں منٹ تک اس امریکی کار کو دیکھتا رہا جس کو نمائش کے ذمہ داروں نے مستقبل کی کار Car of the Future کا نام دیا ہے جب اس کے بارے میں سادھو کا تبصرہ پوچھا گیا تو اس نے گہرے تاثر کے ساتھ جواب دیا "اس نے مجھے اس سوچ میں ڈال دیا ہے کہ دونوں دنیاؤں میں سے وہ کون سی دنیا ہے جس کو میں اپنے لئے زیادہ بہتر سمجھوں" (ہندستان ٹائمز، ۲۰ نومبر ۱۹۷۱) یہ واقعہ بتاتا ہے کہ مادی ساز و سامان نے آج کس طرح ہر شخص کو اس خطرے میں مبتلا کر دیا ہے کہ وہ ان کی ظاہری چمک دمک سے متاثر ہو کر زندگی کی اصل حقیقت کو بھول جائے۔

اس حدیث سے میرا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ امت محمدیہ کے افراد میں جب کوئی کمزوری نظر آئے تو اس کے اسباب سب سے پہلے دنیا کے فتنوں میں تلاش کرنے چاہئیں۔ جب اس امت کا فتنہ دنیا ہے تو امت کی خرابیاں بھی دنیا ہی کی پیدا کی ہوئی ہوں گی۔ جب میں نے اس حیثیت سے غور کیا تو بالآخر میرا ذہن اس پر مطمئن ہو گیا کہ دنیا ہی وہ سب سے بڑا رکن ہے جو حق کی آواز کو آدمی کے لئے قابل فہم اور قابل قبول بننے میں دیتا۔ اسلام کی بلند تر حقیقتوں کو وہی شخص پاسکتا ہے جو دنیا اور دنیا کی چیزوں سے اپنے آپ کو ادا پراٹھا چکا ہو۔ جو اس سے ادا پراٹھا نہ سکے اس کے عین سر کے اوپر حقیقت کی آواز گونج رہی ہو گی مگر اس کو گرفت کرنے کی طاقت سے وہ محروم ہوگا۔ اس کے پاس وہ کان نہیں ہوں گے جن سے وہ سنتے اور وہ دل نہیں ہوگا جن سے وہ اسے سمجھے آپ کی سعادت و ترقی کے تمام امکانات اس وقت تک آپ سے دور ہیں جب تک آپ کی توجہات دنیا کے اندر پکھری ہوئی ہوں۔ آپ کا مومن بننا، آپ کا داعی بننا، آپ کا مجاہد بننا، سب کچھ منحصر ہے اس بات پر کہ اس

سے پہلے آپ ”زهد فی الدنیا“ کی کیفیت اپنے اندر پیدا کر چکے ہوں جو رسول کے الفاظ میں — اولیٰ صلاح  
 ہذا ءالامۃ ہے۔ دنیا پسندی دوسرے نفلوں میں ظاہر پسندی کا نام ہے۔ اور زهد یہ ہے کہ ظاہر کی چیزوں  
 کے سچھے جو اصل حقیقت ہے وہ آدمی کے سامنے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا پسندی سطحیت پیدا کرتی ہے اور زهد  
 سے وہ گہری نظر حاصل ہوتی ہے جو چھپے ہوئے واقعات کو باطل بے نقاب دیکھ لے۔ اور حقیقت سے انتہائی حد تک  
 آشنا ہو کر بول سکے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ما زهد عبدٌ فی الدنیا الا انبت اللہ الحکمة  
 فی قلبہ واطلق بہا لسانہ وبعصر العیب الدنیا  
 وداء ہا و دواء ہا و اخذ حیحہ سالما لئی دار  
 السلام (ربیعہ فی شعب الایمان)

جو شخص دنیا سے بے رغبت ہو جائے اللہ تعالیٰ اس کے  
 دل میں حکمت پیدا کر دیتا ہے اور اس کی زبان پر کلمات  
 حکمت جاری کر دیتا ہے۔ دنیا کے عیب اور اس کا مرض  
 اور علاج اسے دکھا دیتا ہے۔ اور اس کو سلامتی کے گھر  
 (جنت) تک محفوظ لے جاتا ہے۔

یہ حکمت جو زہد کے صلے میں ملتی ہے، یہ خدا کی سب سے بڑی دین ہے جس کو قرآن میں ”خیر کثیر“ کہا گیا ہے  
 یعنی سب سے بڑا خزانہ۔ قرآن کے میان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکمت کا خزانہ اسی کو ملتا ہے جو دوسرے  
 خزانوں سے اپنی نظریں ہٹا لے، جو دنیا کی محبت سے اپنے دل کو خالی کر چکا ہو۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں خدا کی راہ  
 میں خرچ کرنے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد ہوا ہے:

یؤتی الحکمة من یشاء ومن یؤتی الحکمة  
 فقد اوتی خیرا کثیرا

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ”خیر کثیر“ اسی کو ملتا ہے جو ”خیر طویل“ سے اپنے آپ کو خالی کر لے، جو خیر  
 قلیل میں پٹا ہوا ہو، وہ خیر کثیر سے اپنا دامن نہیں بھر سکتا۔

میں چاہتا ہوں کہ آج کی صحبت میں اسی زہد فی الدنیا کے بارے میں کچھ عرض کروں۔ کیوں کہ اپنے مطالعہ اور تجربہ  
 سے میں اس حقیقت پر مطمئن ہو چکا ہوں کہ جب تک کسی کے اندر زہد کی کیفیت پیدا نہ ہو وہ دین کی اعلیٰ حقیقتوں کا  
 ادراک نہیں کر سکتا اور نہ اس کے اندر بھی گہرا عمل پیدا ہو سکتا۔ جس شخص کی آخرت طلبی نے اس کو دنیا کا زاہد نہیں  
 بنایا، اس کے درمیان اور قرآن کے درمیان ایک ”جھاپ مستور“ حال رہتا ہے۔ وہ سنتا ہے مگر نہیں سنتا،  
 وہ سنتا ہے مگر نہیں سمجھتا۔ (بہی اسرائیل ۴۶-۴۵)

زہد فی الدنیا کے معنی ہیں دنیا سے بے رغبتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا سے دل چسپی کا تعلق ختم کر کے  
 اس سے صرف ضرورت کا تعلق یا تو رکھا جائے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو حدیث میں البتجانی من دار الضیور کہا  
 گیا ہے۔ (دھوکا دینے والی جگہ سے دور رہنا) اس دوری کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ دنیا کے کاروبار سے

اگک تھلگ ہو جائیں۔ زہد دراصل دنیا سے سیاتی بے تعلقی کا نام ہے نہ کہ عملی بے تعلقی کا۔ جیسا کہ حضرت سفیان ثوری نے فرمایا، زہد خراب کپڑے اور موٹی کھانے کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک کیفیت ہے جو دل کے اندر پیدا ہوتی ہے ظاہری شکلیں اس اندرونی کیفیت کا فطری اظہار ہیں، نہ کہ بجائے خود کسی ظاہری شکل کا نام زہد ہے۔ یہ باطن ممکن ہے کہ ایک شخص جھوٹی میں رہتا ہو مگر اپنے خیالات و احساسات کے اعتبار سے وہ مکمل طور پر ایک دنیا پسند آدمی ہو۔ اور دوسرا شخص اپنے آپ کو عالی شان عمارتوں کے درمیان پائے مگر دنیا پسندی سے اس کا ذہن غالی ہو زہد کسی مصنوعی تدبیر کا نام نہیں ہے۔ بلکہ وہ آدمی کی ایمانی حالت کا ایک فطری اظہار ہے۔ جب کوئی شخص اعلیٰ حقیقتوں کو پالتا ہے تو اسل حقیقتیں خود بخود اس کی نگاہ میں حقیر بن جاتی ہیں۔ آخری قدروں کی اہمیت کا احساس ذہنی قدروں کو غیر اہم بنا دیتا ہے۔ وہ اپنی ایمانی کیفیت کے باطن لازمی نتیجے کے طور پر دنیا سے بے رغبت ہو جاتا ہے۔ جب آپ کا ذہن خدا کی باتیں سوچنے میں اتنا مصروف ہو کہ آپ دنیا کی باتیں بھولنے لگیں، جب آخرت کی فکر آپ کے اوپر اس طرح چھا جائے کہ دنیا کے غم آپ کو یاد نہ آئیں، جب آنے والے مستقل آرام و تکلیف کا مسئلہ آپ کو اتنا فکر مند بنا دے کہ عارضی آرام و تکلیف کے مسئلہ آپ کے لئے بے حقیقت ہو جائیں۔ جب کل کی زندگی آپ کو اس طرح اپنی طرف پھینچے کہ آج کی زندگی کے بارے میں آپ لوگوں کو غافل نظر آنے لگیں، جب بلند تر حقائق کی طرف متوجہ ہونے کی وجہ سے آپ دنیا میں اس طرح رہنے لگیں گویا آپ دنیا میں نہیں ہیں۔ جب دنیا میں آپ کوئی آرام دیکھیں تو یہ سوچ کر رد پڑیں کہ معلوم نہیں کہ آخرت میں کیا ہونے والا ہے اور جب کوئی تکلیف ستائے تو آپ کی زبان سے نکلے کہ ”خدا یا دنیا کی معمولی تکلیف کا یہ حال ہے تو آخرت میں کیا ہوگا“ جب دنیا کی لذتیں آپ کو تسکین نہ دے سکیں اور دنیا کی رحمتیں آپ کی نگاہ میں حقیر بن جائیں — جب آپ کا حال یہ ہو جائے تو ایسا کا نام زہد فی الدین ہے۔ آنحضرت نے ایک بار اپنے صحابی حضرت عبداللہ بن عمرو کو پوچھا کہ جو نصیحت فرمائی تھی، اس کا ایک فقرہ یہ تھا:

عَدَّ نَفْسَهُ مِنِّ اَهْلِ الْقُبُورِ (بخاری) اپنے آپ کو قبر والوں میں شمار کرو

گویا اللہ تعالیٰ نے ہم کو جو دنیا میں بھیجا ہے اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم یہاں کی نعمتوں میں غرق ہوں اور یہاں رہ کر اپنے دل کی تمنائیں پوری کریں۔ بلکہ وہ تو یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ ہم میں سے کون ہے جو دنیا کو اپنے حوصلوں اور تمنائوں کا قبرستان بناتا ہے۔

اس تشبیہ سے خود بخود یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زہد صرف محرمات دنیا سے بچنے کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسی حالت ہے جس میں آدمی کو بہت سی جائز چیزوں سے بھی اپنے آپ کو محروم کر لینا پڑتا ہے۔ بے شک جو کچھ اللہ تعالیٰ نے حرام ٹھہرایا ہے وہی حرام ہے اور جو کچھ اس نے حلال کیا ہے وہ سب حلال ہے کسی انسان کو حق نہیں کہ اس میں بال برابر کوئی رد و بدل کر سکے، مگر شریعت کی قانونی حدود و ہمارے ارتقا کی آخری حدود نہیں ہے۔ دائرہ ایمان میں داخل ہونے کے لئے یقیناً صرف اتنا ہی کافی ہے کہ آدمی احکام کے قانونی تقاضے پورے کر دے۔ مگر ایمان کے اعلیٰ

مراتب کو حاصل کرنے کا اندویش قانون نہیں، قربانی ہے، اگر آپ خدا کی راہ میں مسابقت کا جذبہ رکھتے ہیں تو آپ کو اپنی خند، اپنا آرام، اپنی لذتیں، سب کچھ چھوڑنی پڑیں گی، ذوق اور عادت کو ہمیشہ کے لئے خیرا کر کہ دینا ہوگا۔ حالانکہ یہ سب کچھ آپ کے لئے جائز ہے اور ان میں سے کوئی بھی چیز شریعت نے حرام نہیں قرار دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسری تمام راجوں کی طرح اسلام کی راہ میں بھی ترقی صرف اسی کے لئے ہے جو قانونی تقاضوں سے بلند ہو کر کام کرنے کا جذبہ رکھتا ہو۔ جو یہ نہ دیکھتا ہو کہ دنیا کی چراگاہ میں اس کے لئے کیا کیا جائز ہے بلکہ جس کی نگاہ اس پر لگی ہوئی ہو کہ کتنے عظیم امتحان میں اسے پیش ہونا ہے اور اس کے لئے کتنی بے پناہ تیاریوں کی ضرورت ہے۔ ایسا شخص یقیناً بہت کم ایسی چیزوں سے فائدہ اٹھانے سے محروم رہ جائے گا جو اس کے لئے شرعاً حلال تھیں۔ جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

لا يبلغ العبد ان يكون من الملتقين  
حتى يدع مالا باس به حدثاً لسا  
بسا باس (ترمذی، ابن ماجہ)

کوئی شخص متقیوں میں شمار کئے جانے کے قابل نہیں ہو سکتا  
جب تک اس کا یہ حال نہ ہو جائے کہ وہ ان چیزوں کو  
چھوڑ دے جن میں کوئی حرج نہیں ہے ایسی چیزوں سے  
بچنے کی خاطر جن میں واقعتاً حرج ہے۔

اس "چھوڑنے" کی دو صورتیں ہیں۔ ایک، ایسی چیزوں کو چھوڑنا جو بذات خود مشتبہ ہوں۔ دوسرے، ایسی چیزوں کو چھوڑنا جو بذات خود مشتبہ نہ ہوں مگر ان کے متعلق یہ شبہ ہو کہ وہ آدمی کو غلط انجام تک پہنچا سکتی ہیں۔ پہلی صورت میں متعلقہ چیز کی حرمت کا یقین تو نہیں ہوتا مگر اس کی حلت کے بارے میں بھی ذہن پوری طرح مطمئن نہیں ہوتا۔ اس لئے آدمی احتیاط کی بنا پر اسے ترک کر دیتا ہے۔ دوسری صورت میں متعلقہ چیز اصلاً باطل جائز ہوتی ہے مگر اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ ایسے نتائج پیدا کرے گی جو صحیح نہ ہوں۔ مثلاً دنیا کا عیش و آرام فی نفسہ باطل جائز ہے۔ مگر ایک احساسِ دہن اسے صرف اس لئے بچتا ہے کہ وہ ڈرتا ہے کہ اس میں پڑ کر اس کا نفس موتا ہو جائے گا۔ اس کے درمیان اپنے آپ کو یاد رکھو اور اس کے اپنی فائدان غلط قسم کے احساسِ برتری میں مبتلا ہو جائیں گے، دنیا کی آسودہ زندگی "کامیابی" کا غلط احساس پیدا کرے گی اور اس طرح آخرت میں کامیابی حاصل کرنے کی فکر نفسیاتی طور پر مضمحل ہو جائے گی۔

زہد فی الدنیا سے وہ انسان کیسے بنتا ہے جو ترقی کے اعلیٰ مراتب طے کر سکے، اس کے بہت سے پہلو ہیں، میں یہاں چند خاص پہلوؤں کا ذکر کروں گا۔

۱۔ زہد فی الدنیا سے جو چیزیں حاصل ہوتی ہیں ان میں پہلی چیز وہ ہے جس کو میں استغراق یا ذہنی یک سوئی کے لفظ سے تعبیر کروں گا۔ دنیا سے جتنا زیادہ آپ کا تعلق ہوگا اتنا ہی زیادہ آپ کے خیالات منتشر ہوں گے، اندر سے تعلق جتنا کم ہوگا اتنا ہی آپ اپنے خیالات کو یک جا کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ حقیقت ایک نہایت لطیف چیز ہے اس لئے اس کو گرفت کرنے کے لئے غیر معمولی ذہنی ارتکاز بہت ضروری ہے جس نے اپنی فکر کو مختلف سمتوں میں پھیلایا

رکھا ہو وہ ہرگز اعلیٰ حقائق کا ادراک نہیں کر سکتا۔ تاریخ سائنس کا عظیم ترین نام "نیوٹن" اپنے چھپے ہوئے عظمت رکھتا ہے اس کا سب سے بڑا راز نیوٹن کا ذہنی استغراق تھا۔ وہ اپنے بچپن میں، Wool Gatherer کہا جاتا تھا۔ یعنی کھویا ہوا شخص۔ لوگ اسے نیوٹن کا طبعی نقص سمجھتے تھے۔ مگر بعد کو معلوم ہوا کہ اس کی یہ کیفیت اس کی استغراقی صلاحیت کی وجہ سے تھی۔ وہ کسی مسئلہ خاص پر ذہن کو بالکل مرکوز کر کے سوچنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا تھا۔ اپنی خصوصیت کی وجہ سے وہ بہت جلد مسائل کی ترمیم پہنچ جاتا تھا۔ اور انتہائی پیچیدہ سوالات جن کے حل کرنے میں دوسرے لوگ مہینوں لگا دیتے تھے وہ انہیں گھنٹوں میں حل کر کے رکھ دیتا تھا۔

اگر آپ اس کے کوسے میں داخل ہوں تو آپ کے سامنے کتابوں اور کاغذات کی ایک بے ترتیب دنیا ہوگی جس میں کسی اہتمام کے بغیر ایک شخص اس طرح کھڑا بیٹھا ہوا نظر آئے گا جیسے وہ کوئی مجسمہ ہے جو کسی اسلیم کے بغیر اس ڈھیر میں لاکر ڈال دیا گیا ہے۔ مشہور سائنس دان اڈمنڈ ہالی Edmund Halley جس کے نام پر ایک مدار ستارہ ہالی کا مٹ Halley Comet کہا جاتا ہے۔ اس نے یہ مدار ستارہ معلوم تو کر لیا تھا مگر اس کے مدار کا حساب لگانے میں وہ کوشش کے باوجود ناکام رہا۔ اس سلسلے میں مدینے کے لئے وہ نیوٹن کے پاس گیا۔ وہاں سے اسے سخت حیرت ہوئی کہ اچھے ہوئے بالوں والا یہ آدمی اس کو پہلے ہی حل کر چکا ہے۔ اس نے اس کا حساب دیکھنا چاہا۔ مگر یہ نیوٹن کا کہہ تھا۔ کوشش کے باوجود بھرے ہوئے بے ترتیب انبار میں متعلقہ کاغذ برآمد نہ ہو سکا۔ نیوٹن نے فوراً ہی ایک سادہ کاغذ لیا اور اس انتہائی پیچیدہ ریاضیاتی سوال کو دوبارہ حل کر کے اسی وقت پہلی کے سامنے رکھ دیا۔ پہلی اس واقعہ سے بہت متاثر ہوا جب اسے معلوم ہوا کہ نیوٹن کی تصنیف Principia ابھی تک اس کے ڈسک کے ایک خانہ میں ردی کاغذات کی طرح بھری ہوئی رکھی ہے، تو اس نے کہا کہ ایسے قیمتی دماغ کے انکار اس طرح چرے رہنے کے لئے نہیں ہیں۔ چنانچہ اس نے اپنے تخریب سے اس کو چھپوانے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح نیوٹن کی یہ کتاب پہلی بار دنیا کے سامنے آئی۔

نیوٹن صرف مادی دنیا کے کچھ حقائق جاننا چاہتا تھا، اس کے لئے اُسے اس طرح مستغرق ہونا پڑا کہ وہ اپنا کھانا، اپنا سونا، اپنا آرام، اپنا ذوق، اپنی عادتیں، سب بھولی گیا۔ تو آپ جن فریادی حقائق کا تصور اپنے ذہن میں جمانا چاہتے ہیں، ان کو شدید ذہنی استغراق کے بغیر کس طرح پاسکتے ہیں۔ آسمان پر جو ستارے بگ لگاتے ہوئے نظر آتے ہیں ان کی حرکت کے قوانین منضبط کرنے کے لئے نیوٹن کو انکار میں آنا ڈوبنا پڑا گیا اس نے اپنے آپ کو دنیا سے اٹھا کر اسی خلا میں پہنچا دیا ہے جہاں یہ روشن اجسام حرکت کر رہے ہیں۔ پھر وہ حقیقتیں جو ستاروں سے بھی دور ہیں، جو ثنائی ہوتی شکل میں بھی آنکھوں کو نظر نہیں آتیں، ان کو بے پناہ ذہنی کیسوئی کے بغیر کیسے گرفت کیا جاسکتا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ اس طرح خدا کی عبادت کریں گویا کہ آپ اسے دیکھ رہے ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ قیامت اور جنت و دوزخ کا تصور ہر وقت آپ کی نگاہوں کے سامنے رہے، اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ ایسے ہو جائیں کہ آپ جہاں ہوں اور جو کام بھی کر رہے ہوں، ہر حال میں آپ کا سینہ "ذکر کثیر" سے لبرز رہے۔ اگر آپ اپنے اندر

وہ شدید یقینی اندوہ زبردست استحضار دیکھنا چاہتے ہیں جو دل کو پھلادے اور آنکھوں کو اشکبار کر دے تو یہ سب کچھ اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ آپ حدیث کے الفاظ میں ”تشعب ہوم“ کو ختم کر کے اپنی ساری نظریں صرف ایک نقطہ پر لگا دیں۔ ارجم کے مشہور واقعہ کی طرح آپ کو درخت اور چڑیا اور پتے اور پھل نظر نہ آئیں بلکہ صرف ایک چیز نظر آئے۔۔۔ شکار کی بائیں آنکھ“

جب آپ یہ ذہنی کم شدگی اور یہ استغراق اپنے اندر پیدا کریں گے تو عادت اور ذوق کے تقاضے آپ کا ساتھ چھوڑنے پر مجبور ہوں گے، لذتوں اور سانسوں کا خیال مدغم چڑ جائے گا۔ فکر کی زیادتی جسمانی تقاضوں پر غالب آنے لگے گی۔ آپ کا ہنسنا اور بولنا کم ہو جائے گا، تصوراتی دنیا کو پانے کی کوشش میں آپ مادی دنیا سے دور ہوتے ہوئے نظر آئیں گے۔ اس وقت ممکن ہے لوگ کہیں تم پاگل ہو گئے ہو۔ مگر اس سے گھبرائیے نہیں، کیونکہ یہی وہ صحیح ترین خطاب ہے جو کسی بامقصد آدمی کو اہل دنیا کی طرف سے دیا جاسکتا ہے۔

۲۔ زہد فی الدنیا کے ذریعہ دوسری چیز جو حاصل ہوتی ہے وہ لطافت روح ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مادی دنیا میں آدمی جتن زیادہ مشغول ہوگا۔ اس کی روح میں اسی قدر کثافت پیدا ہوگی۔ اور جتنا وہ اس سے اپنے آپ کو دور لے جائے گا اسی کے بقدر اس کی روح پاک اور خالص ہوتی چلی جائے گی۔ یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں رہبانیت کی تبلیغ کر رہا ہوں، رہبانیت دنیا سے اپنے آپ کو الگ کر لینے کا نام ہے حتیٰ کہ اس مقصد سے اگر کوئی شخص اپنے آپ کو مار ڈالے تو یہ بھی رہبانیت فلسفہ کے مطابق جائز ہوگا۔ اس کے برعکس زہد یہ ہے کہ آدمی مکمل طور پر اسی دنیا میں ہو۔ مگر اس سے بے رغبت ہو چکا ہو۔ وہ دنیا میں رہتے ہوئے ذہنی حیثیت سے اس سے باہر نکل جائے۔ مومن بھی یقیناً راہب ہوتا ہے۔ مگر اس کی رہبانیت حقیقی رہبانیت ہے جب کہ دوسرے مذاہب جسمانی رہبانیت میں عقیدہ رکھتے ہیں۔

”اللہ تعالیٰ نے کسی کے سینے میں دو دل نہیں بنائے“ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے احساسات کسی ایک ہی چیز کے بارے میں شدید ہو سکتے ہیں۔ وہ دو دمنوں میں حرکت نہیں کر سکتے۔ اگر آپ دنیا اور اس کے ساز و سامان کو اہمیت دینے لگیں تو آخرت کا خیال آپ کے اندر کمزور پڑ جائے گا اور اگر آپ آخرت کی فکر میں مشغول ہوں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا کے بارے میں آپ پر غفلت طاری ہونے لگے گی۔ جو شخص دنیاوی قدروں کو اہمیت دیتا ہے، اس کا لازمی مطلب یہ ہے کہ وہ آخری قدروں کو پامال کر رہا ہے۔ آپ کو ایسے ”خوش مذاق“ ملیں گے جن کے کھانے کی پلیٹ میں بھی پڑ جائے تو وہ اس کو کھانا پسند نہیں کریں گے۔ دوسری طرف ان کے اسلام میں کتنی ہی کلیں پڑی سڑ رہی ہوں گی۔ مگر اس کی عفویت کا انھیں اندازہ نہ ہوگا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ دنیا کی طرف رغبت نے آدمی کی حسیات کو دنیا کے بارے میں تو بہت تیز کر دیا، مگر اس کا دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ آخرت کے بارے میں اس کی حسیات کند ہو کر رہ گئیں۔

یہ دنیا جو آپ کے جسم کو موٹا کرتی ہے۔ یہ آپ کی روح کی قاتی ہے۔ اگر آپ اس کے اندر لذت ڈھونڈنے

لگیں، اگر اس کے سطحی اور ظاہری ساز و سامان آپ کو اپنی طرف کھینچ لیں، تو وہ آپ سے آپ کا سب سے بڑا جوہر چھین لیں گے۔ اس کے بعد آپ کے نازک جذبات مردہ ہو جائیں گے، آپ کے اندر وہ لطیف احساسات ابھر نہیں سکتے جو حقیقی ترین حقائق کا ادراک کرتے ہیں۔ جن پر تعلیمات الہی کا نزول ہوتا ہے۔ جس کے بعد آدمی تمام مجاہبات سے بلند ہو کر حقیقت کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے جس کے اندر دنیا سے بے رغبتی پیدا نہیں ہوئی، اس کے اندر گویا وہ صلاحیت ہی پیدا نہیں ہوئی جو کسی حقیقت کو سمجھے اور اسے قبول کر سکے۔ ظاہر ہے کہ ایسے دل میں حکمت کا "انبات" نہیں ہو سکتا۔ جس زمیں میں اخذ کی صلاحیت نہ ہو وہ کیسے کسی بیج کو قبول کرے گی اور اس کے اندر ڈالا ہوا دانہ نشوونما پا کر پورا درخت کیسے بن سکتا ہے۔ یاد رکھئے، حقیقت ایک غیر مادی چیز ہے۔ اس لئے وہ روح جو مادی آلاتوں میں پھنسی ہوئی ہو، وہ حقیقت کو بے نقاب حالت میں نہیں دیکھ سکتی۔ اس کا مشاہدہ ہمیشہ دھندلا مشاہدہ ہو گا جس میں حقیقت کے بعض رخ دکھائی دیں گے اور بعض رخ نظروں سے اوجھل ہو جائیں گے۔

روح کی لطافت اور کثافت کوئی تصوف کا پُراسرار مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ بالکل ایک سادہ سی حقیقت ہے جس کو ہر شخص معمولی غور و فکر سے سمجھ سکتا ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ آپ کا جو حیاتیاتی اور تصوراتی وجود ہے وہ کسی اور کی محبت میں اٹکا ہوا ہے یا اس نے اپنے آپ کو دوسری تمام چیزوں کی گرفت سے باہل خالی کر دیا ہے تاکہ مالکِ حقیقی کی یاد آپ کی روح کو اپنا مسکن بنا سکے۔ گھر میں بیٹی اگر مسجد میں چلی کا پنکھا چلایا جائے اور اس کی جوا میں نماز ادا کی جائے تو ظاہر ہے کہ کوئی اسے نا جائز نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اگر اللہ کے ذکر سے خالی ہو تو یہ حال ہوتا ہے کہ مسجدوں میں نماز کے لئے آنے والے پنکھے کے نیچے جگہ حاصل کرنے کے لئے مسابقت کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ نماز کے دوران میں اگر کرٹ رکنے کی وجہ سے پنکھا بند ہو جائے تو سلام پھیرتے ہی ہر شخص کی نظر نیا اور پراٹھ جاتی ہیں اور نماز کے بعد پورا سپلائی کے انتظام کی خرابی وہ اہم ترین موضوع ہوتا ہے جس پر لوگ اپنے جذبات اور اپنی مصلحتوں کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کی آرام طلبی نے آپ کی روح کو گنداکر دیا۔ اس میں گرمی اور سردی کے مسائل نے اپنے آشیانے بنا لئے۔ ظاہر ہے کہ ایسا آدمی وہ نماز نہیں پڑھ سکتا جو ساری لذتوں سے بڑھ کر لذیذ ہے۔ جس میں مشغول ہو کر آدمی گرد و پیش سے بے خبر ہو جاتا ہے، جب ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ اپنی دنیا سے نکل کر خدا کی دنیا میں پہنچ گیا ہے۔

مجھ کو بار بار اس کا تجربہ ہوا کہ ایک شخص اپنے ذوق اور اپنی عادتوں کے معاملے میں تو نہایت حساس ہے۔ اپنے طبعی تقاضوں میں کسی کو وہ کسی حال میں برداشت نہیں کرتا۔ مگر ایسے معاملات جو خدا اور آخرت سے متعلق رکھتے ہیں۔ جو اس کی دوامی زندگی کو بہتر یا بدتر بنانے والے ہیں ان میں وہ اکثر نہایت سنگین حقیقتوں کو اس طرح نظر انداز کر دیتا ہے گویا ان کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ اس کے سامنے آپ قرآن وحدیث کے صریح ارشادات پیش کیجئے، مگر وہ ایسے سرسری جوابات دے کر بات کو ٹال دے گا کہ آپ حیرت میں یہ سوچتے رہ جائیں گے کہ ”دوبارہ ان کا کوئی جواب بھی دوں یا نہیں“ اس کی وجہ یہی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو دنیا سے اوپر اٹھائیں سکا۔ اس کے ایمان بالآخرت نے

اس کی روح کو ابھی تک دنیا کی کشمکشوں سے پاک نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کی حسیات انہیں معاملات میں زیادہ کام کریں گی جہاں وہ عملاً پڑا ہوا ہے۔ مگر جس دین سے وہ دور ہے جہاں اس نے ابھی تک اپنے آپ کو پہنچا نہیں اس کی حقیقتوں کو وہ کیسے گرفت کر سکتا ہے اور ان کے ذکر سے کس طرح اس کے اندر بل پل بربا ہو سکتی ہے — شخصیت پرستی کسی کے ذہن کی تمام کھڑکیاں بند کر دے تو حق کی روشنی اس کے اندر کس ماہ سے داخل ہوگی۔

اگر آپ چند آدمیوں کے ساتھ بیٹھے ہوں اور بیکار ایک تار آئے کہ آپ کے اکلوتے لڑکے کا انتقال ہو گیا، تو دوسرے لوگ جیسے پہلے تھے ویسے اب بھی رہیں گے مگر آپ تڑپ اٹھیں گے۔ آپ کی حالت بالکل بدل جائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس شخص کے متعلق خبر آئی ہے اس کی خبر سننے کے لئے پہلے سے آپ کے دل کے تمام گوشے خالی تھے اس لئے وہ سیدھی آپ کے دل میں گھس گئی۔ اس کے برعکس بقیہ لوگوں کے دل میں اس نے جانے کا راستہ نہیں پایا کیوں کہ ان کے دل کچھ دوسرے لوگوں کی محنت سے بھرے ہوئے تھے۔ ٹھیک اسی طرح جب قرآن کی "تلاوت" ہو رہی ہو۔ جب کلمات حکمت سنائے جا رہے ہوں، جب کوئی منادی کرنے والا ایمان کی منادی کر رہا ہو، تو اس کی آواز انہیں لوگوں کے دل سے ٹکرائے گی جنہوں نے اپنا سینہ اس کے لئے کھلا رکھا ہو۔ اور جس نے اپنے اندرون کو دوسری پرستشوں کا گودام بنا رکھا ہے اس پر کوئی آواز اثر نہیں کر سکتی، وہ تو اسی وقت سے لاجب صاف عظیم اس کے کان کے پردے پھاڑ دے۔

۳۔ زہد کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ وہ آپ کے لازم زندگی میں کمی کر دیتا ہے۔ ہر با مقصد آدمی فطرتاً ایک تضاد میں مبتلا کیا گیا ہے۔ ایک طرف اس کے جسم کے تقاضے ہیں جن کی فہرست کا کوئی شمار نہیں۔ اور دوسری طرف اس کا مقصد ہے جو تقاضا کرتا ہے کہ ساری توجہ اسی کی طرف لگا دی جائے۔ اس تضاد کو ہم باطنیہ ختم نہیں کر سکتے ہماری بہترین عقل مندی یہ ہے کہ ہم اس میں کمی کی کوشش کریں۔ دنیا کے تمام وہ لوگ جنہوں نے کوئی بڑا کام انجام دیا ہے، وہ اپنے مشن کی تکمیل کے لئے مجبور تھے کہ اپنے لازم حیات میں ہر ممکن حد تک کمی کریں۔ آپ کے سامنے بھی ایک عظیم مشن — دنیا کے سامنے حق کی گواہی دینے کا مشن، ہے۔ اس لئے اگر آپ اسے تکمیل تک پہنچانا چاہتے ہیں تو آپ کو بھی اسی اصول پر عمل کرنا ہوگا۔ البتہ اس میں اسلام کے اپنے نظریے زندگی کا لحاظ ضروری ہے۔ میں ہرگز یہ نہیں کہوں گا کہ آپ نیوٹن کی طرح شادی نہ کریں۔ مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ آپ نیوٹن کی طرح سلگت نہ بنیں۔ کیوں کہ شادی ایک حقیقی ضرورت ہے جب کہ تباہی، انسان کی نظری ضرورتوں پر ایک مصنوعی ضرورت کا اضافہ ہے۔

لازم حیات میں کمی کا یہ پہلو تو بالکل واضح ہے کہ وہ آپ کو اپنے مقصد میں زیادہ حصہ لینے کے قابل بناتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ کی دیگر ضروریات کی فہرست یعنی مختصر ہوگی، اسی کے بقدر آپ اپنے مقصد کے کاموں کے لئے زیادہ فارغ ہوں گے۔ خلا کا ایک مسافر راکٹ میں بیٹھ کر تین سو میل فی منٹ کی رفتار سے اڑتا ہے۔ مگر اس سفر میں بھی بھاری لمبوسات اور مختلف قسم کے آلات سے وہ لیس ہوتا ہے، ان کو اپنے جسم پر لادے ہوئے زمین پر پیدل چلنا ہو تو وہ چند میل بھی مشکل سے اپنے آپ کو گھسیٹ کر لے جاسکے گا۔ اسی طرح الٹ آپ نے اپنی زندگی کو حقیقی ضروریات

کے ماسوا اور بہت سی ضرورتوں کا عادی بنا لیا ہے تو ان کو لئے ہوئے آپ زمین پر نہیں چل سکتے۔ جب تک یہ لوازم آپ کے گرد جمیا ہوں آپ متحرک نظر آئیں گے۔ مگر جہاں یہ لوازم رخصت ہوئے، آپ اسی طرح اپنے آپ کو بے بس پائیں گے جیسے غنیمت سلطنت کے آخری شہزادے پاگلی کی سواری کا عادی ہونے کی وجہ سے قدر کے دقت بھاگ نہیں سکے اور ان کے دشمنوں نے محل میں گھس کر ان کے بستروں پر انھیں قتل کیا۔

مگر لوازم حیات کو مختصر کرنے کا ایک اور فائدہ ہے جو اسلامی اعتبار سے اس سے زیادہ قیمتی ہے۔ وہ یہ کہ اس طرح کے لوازم میں جتنی کمی ہوگی اسی کے بقدر آپ کے اندر زیادہ سونوارا خلاص پیدا ہوگا۔ اگر آپ کو ایک ہزار میل دور سے آکر یہاں تقریر کرنی ہے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ میرے لئے اپیشیل سیلون میں سفر کرنا ضروری ہے تاکہ جب میں اسٹیشن پر اتروں تو بالکل تازہ دم رہوں اور جگہ گاہ پہنچ کر اپنے موضوع پر اچھی طرح بول سکوں، بیشک آپ کے لئے ایسا کرنا جائز ہے۔ کسی کو جرأت نہیں کہ اس کے خلاف فتویٰ دے سکے۔ بلکہ بہت سے ظاہر بینوں کو آپ کا زور خطابت اس دلیل کی مقبولیت ماننے پر یہاں تک مجبور کر سکتا ہے کہ وہ آپ کے لئے مخصوص سیلون میں سفر کرنا ہی افضل سمجھے۔ لگبگ کیونکہ اس کے بغیر اتنی شان دار تقریر جو دہش نہیں آسکتی تھی۔ مگر میں کہوں گا کہ خدا کو شان دار تقریر مطلوب نہیں ہے۔ اس کو تو آپ کے دل کے ٹکڑے درد کا رہیں۔ اور وہ تقریر جس میں آپ کے دل کے ٹکڑے الفاظ بن کر چلیں، جو دوسروں کو متاثر کرنے سے پہلے خود آپ کو رلا دے، جو تقریر نہ ہو بلکہ درد اور تڑپ کا ایک حجم اظہار ہو۔ وہ تو اسی وقت ممکن ہے جب کہ آپ بے آرامی سے سفر کے یہاں پہنچے ہوں جس میں یہاں تک اپنے آپ کو لانے میں اپنے مشقت اٹھانی ہو جو آپ کے لئے محض سفر نہ ہو بلکہ خدا کی طرف بڑھنے کا ایک مجاہدہ ہو۔ اسی ہی ایک زبان سے کلمات درد مل سکتے ہیں۔ درد مند کلام، خدا کا ایک الہام ہے جو براہ راست عالم الغیب و الشہادۃ کی طرف سے آپ کے اوپر القا کیا جاتا ہے۔ اور قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کا الہام ایک "قول نقیص" ہے جو کسی ایسے قلب ہی پر ستر سکتا ہے جو "و طاشدیتہ کے مرحلے سے گزر چکا ہو (سورہ مزمل)

امام احمد اور امام ترمذی کی روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بار اپنے رسول کو سونے کی عظیم ترین کان پینے کی پیشکش کی، رسول نے جواب دیا، خدایا نہیں، بلکہ مجھے اس طرح رکھئے کہ کسی روز کھاؤں اور کسی روز بھوکا رہوں۔ تاکہ جب میں کھاؤں تو آپ کا شکر ادا کروں اور جب بھوکا رہوں تو آپ کے سامنے گریہ و زاری کروں۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی حالات کے بغیر اپنے اندر کیفیات پیدا نہیں کر سکتا۔ جو حالات سے خالی ہو جائے وہ کیفیات سے بھی خالی ہو جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ سختی اور مشقت کے لمحات اپنے اندر دو طرفہ فائدہ رکھتے ہیں۔ ایک طرف ان سے وہ "درد" حاصل ہوتا ہے جو دل کی زندگی ہے، جو آپ کی حاسر حیات سے آشنا کرتا ہے۔ جو انسان کی اندرونی صلاحیتوں کو بیدار کرنے والا ہے۔ دوسری طرف مشقت کے لمحات ہی آپ کی راحت کے لمحات کو اسلامی رنگ دیتے ہیں۔ وہ آدمی کو اس قابل بناتے ہیں کہ جب وہ ایسی کوئی چیز دیکھے تو اس کا دل شکر کے جذبے سے لرزہ ہو جائے۔ جو درد سے خالی ہے وہ زندگی سے خالی ہے، اور جو زندگی سے محروم ہو وہ کیسے کوئی بات سے گا اور کیسے کوئی بات قبول کرے گا۔

۴۔ نہ ہدفی الدنیا کا ایک اور پہلو ہے۔ وہ یہ کہ ایسا آدمی حرام اور شقیہ چیزوں میں پڑنے سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ناجائز چیزوں کے ارتکاب سے وہی شخص بچ سکتا ہے جو جائز حدود میں بھی بچ کر چلتا ہے۔ جو تمام ”جائز“ چیزوں کو اپنا ضروری حق سمجھ لے، ایسے آدمی کے لئے ہر وقت خطہ ہے کہ وہ کسی حرام کام میں پڑ جائے۔ حدیث کے الفاظ میں، ہر بادشاہ کی ایک ممنوعہ چراگاہ ہوتی ہے اور خدائی چراگاہ وہ چیزیں ہیں جن کو اس نے حرام قرار دیا ہے جو شخص سرحد تک اپنے مویشی چراتا ہوا پہنچ جائے اس کے لئے ہر آن یہ خطہ ہے کہ مویشی کوس چراگاہ کے اندر نہ گھس جائیں۔ (متفق علیہ) عورتوں کے لئے زیب و زینت باطل جائز ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ ہر وہ گھر جس نے اس حجاز کو اپنے لئے کھلا دروازہ کھلے رکھا ہے، آج اس کے یہاں غیر سائبر ملوسات اس طرح استعمال ہونے لگے ہیں کہ اب لوگوں کو شاید ان کے ممنوع ہونے کا بھی احساس نہیں رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کل کے بے دین گھرانے اور اسلام پسند گھرانے میں بس اتنا ہی فرق رہ گیا ہے کہ ہمارے گھروں کی عورتیں اندر لڑکیاں خاندان اور رشتہ کے لوگوں اور دوسرے نئے دالوں کے سامنے اپنی غیر شرعی پوشاک کا مظاہرہ کرتی ہیں اور دوسرے گھرانوں کی عورتیں اپنے اس فتنہ کو لے ہوئے باناروں اور شرکوں پر نکل آتی ہیں۔ اسی طرح سرکاری ملازمتوں میں جو لوگ ترقی کرتے ہیں یا بڑے عہدے حاصل کرتے ہیں وہ ضعیف کی قربانی دے کر ہی ان مناصب تک پہنچتے ہیں جو جوہرہ زمانے میں کسی ادنیٰ کسی کو اپنی نشست گاہ بنانے کے لئے جو یا وقت درکار ہے اس میں سے ایک ضروری چیز یہ بھی ہے کہ دین کو آپ اپنے اندر سے کھریں کہ کمال دیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بادشاہوں سے تعلق رکھنے والوں کے بارے میں کہا تھا ”اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، تم ان کی دنیا میں سے جتنا یادو گے اس سے زیادہ وہ تمہارے دین میں سے لے لیں گے“۔ یہ بات جدید بادشاہت کے بارے میں بھی اسی طرح صحیح ہے جیسے وہ قدیم بادشاہت کے بارے میں صحیح تھی۔ اس فرق کے ساتھ کہ سب سے پہلے وہ دین کا زیادہ حصہ لیتے تھے اور اب وہ آپ کا کل دین لے لیتے ہیں۔

ایک بڑے تاجر نے ایک مرتبہ کہا کہ موجودہ زمانے میں بالکل جائز طریقہ پر کوئی بڑا کاروبار نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں آپ کی آمدنی ایک خاص حد سے آگے بڑھی، بے شمار قوانین آپ کو چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں۔ آپ مجبور ہوتے ہیں کہ غلط طریقے سے کام کریں۔ ورنہ آپ کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔ اتنے بڑے کاروبار کا آپ کو مکلف کس نے کیا ہے، جواب دینے والے نے جواب دیا۔ مگر موجودہ انسان کو اس قسم کے جوابات سے کوئی دل چسپی نہیں۔ اس نے تو یہ طے کر رکھا ہے کہ وہ اپنے امکان بھران تمام نعمتوں کو حاصل کرے گا جو خدائے زمین پر پیدا کی ہیں۔ اس لئے یہ بھی ضروری ہو گیا ہے کہ وہ ان تمام چیزوں کو اپنے لئے حلال کر لے جس کو خدائے حرام ٹھہرایا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ترقی کا ہر واقعہ جو آپ کو اپنے گرد و پیش نکھرتا ہے، وہ صرف حکمت زہد سے محدودی کا ثبوت نہیں ہے۔ بلکہ اس سے ٹوہہ کر وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی بڑھتے بڑھتے خدائی حرام کی ہونی چراگاہ میں گھس گیا ہے۔ اس کے بغیر وہ اتنی غیر معمولی فریبی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

مکن ہے یہ باتیں سن کر آپ کہیں کہ اسلام کا مطلب اگر یہی ہے تو اس کا پانا باہمت مشکل ہے۔ بیشک اسلام کا

پاناہت مشکل ہے مگر وہ خدا کی مدد سے آسان ہو سکتا ہے۔ حضرت مسیحؑ نے جب روح دین کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ”میں تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سونے کے ناکے میں سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہی میں داخل ہو“ تو ان کے شاگرد یہ کہ بہت اچھے میں پڑ گئے اور کہنے لگے کہ پھر کون نجات پاسکتا ہے۔ آپ نے ان کی طرف دیکھ کر فرمایا — ”یہ آدمیوں سے تو نہیں ہو سکتا لیکن خدا سے سب کچھ ہو سکتا ہے“ اگر آپ اسلام کو اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتے ہیں، اگر آپ وہ حیات طیبہ حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے تو اس کو پانے کی صورت ہی ہے کہ آپ اسے خدا سے مانگیں۔ دوسری تمام چیزوں کی طرح یہ سب سے قیمتی چیز بھی آپ کو خدا ہی سے ملے گی۔ کہیں اور سے آپ اسے حاصل نہیں کر سکتے۔ مگر یاد رکھئے خدا سے مانگنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ دعا کے کچھ مقرر الفاظ یاد کر لیں اور اسے اپنی زبان سے دہرا دیا کریں ایک عسائی عالم کے الفاظ میں :-

God is not a Cosmic belly-boy for whom  
we can press a button to get things.

خدا سے مانگنے کی اصل زبان وہ نہیں جو لفظوں کی صورت میں اپنے مطالبات کا اظہار کرتی ہے۔ اس سے مانگنے کی زبان آپ کا قلب ہے۔ آپ اپنی حقیقی زندگی سے جو کچھ چاہ رہے ہیں وہی دراصل آپ اپنے رب سے مانگتے ہیں۔ خدا آپ کے لفظوں کو نہیں دیکھتا۔ وہ خود آپ کو دیکھتا ہے۔ آپ اپنے اصل وجود میں جس چیز کے لئے بے قرار ہوں اپنے رب سے آپ اسی چیز کے طلب گار ہیں۔

ایک بچہ اپنی ماں سے روٹی مانگے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ ماں اس کے ہاتھ میں انگارہ رکھ دے۔ خدا اپنے بندوں پر اس سے زیادہ مہربان ہے۔ یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ آپ خدا سے خشیت مانگیں اور وہ آپ کو تسوات دیدے۔ آپ خدا کی یاد مانگیں اور وہ آپ کو نسیان میں مبتلا کر دے۔ آپ آخرت کی تڑپ مانگیں اور وہ آپ کو دنیا کی محبت میں ڈال دے، آپ کیفیت سے بھری ہوئی دینداری مانگیں اور وہ آپ کو بے روح دینداری میں پڑا رہنے دے۔ آپ حق پرستی مانگیں اور وہ آپ کو شخصیت پرستی کی تاریک کوٹھڑی میں بند کر دے۔ آپ کی زندگی میں آپ کی مطلوب چیز کا نہ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ نے ابھی تک اس کو مانگا ہی نہیں۔ اگر آپ کو دودھ خریدنا ہو اور آپ پھلپنی لے کر بازار جائیں تو ظاہر ہے کہ بیسے خرچ کرنے کے باوجود آپ خالی ہاتھ واپس لوٹیں گے۔ اسی طرح اگر زبان سے آپ دعا کے کلمات دہرا رہے ہوں مگر آپ کی اصل ہستی کسی اور طرف متوجہ ہو تو میں کہوں گا کہ آپ نے مانگا تھا اور نہ آپ کو ملا۔ جو مانگے وہ بھی محروم نہیں رہ سکتا۔ یاد رکھئے، یہ مالک کائنات کی غیرت کے خلاف ہے کہ وہ کسی بندے کو اس حال میں رہنے دے کہ قیامت میں جب خدا سے اس کا سامنا ہو تو وہ اپنے رب کو حسرت کی نظر سے دیکھے۔ وہ کہے کہ خدا! میں نے تجھ سے ایک چیز مانگی تھی مگر تو نے مجھے نہ دی۔ بخدا یہ ناممکن ہے، یہ ناممکن ہے، یہ ناممکن ہے۔ کائنات کا مالک تو ہر صبح و شام اپنے سامنے خزانے کے ساتھ آپ کے قریب ترین اگر آواز دیتا ہے۔ ”کون ہے جو مجھ سے مانگے تاکہ میں اسے دوں، مگر تجھیں لینا ہے وہ سو پہے ہوں تو میں دینے والے کا کیا تشنور۔ (زندگی شعبان ۱۳۸۱ھ)

تقریر صلحہ دار اجتماع جماعت اسلامی ہند بمقام جون پور۔ ۱۲ نومبر ۱۹۶۱

## دعوتِ اسلامی کے کارکنوں کی ذمہ داریاں

دنیا میں روزانہ لاکھوں آدمی پیدا ہوتے ہیں اور لاکھوں آدمی مر جاتے ہیں۔ وہ یہاں آنکھیں بند کئے ہوئے آتے ہیں اور انھیں کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ ان کی زندگی کا مقصد کیا ہے اور انھیں کیا کرنا چاہئے۔ پھر صبح یا غلط جو کچھ ان کی سمجھ میں آتا ہے کرتے ہیں اور دوبارہ آنکھیں بند کر کے اسی دنیا کی طرف لوٹ جاتے ہیں جہاں سے وہ آئے تھے۔ وہ نہیں جانتے کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور آئندہ ان کے ساتھ کیا معاملہ ہونے والا ہے۔ یہ ایک عظیم خطرہ ہے جس سے انسانی نسل دوچار ہے۔ دنیا کی مثال ایک ایسی ریل گاڑی کی ہے جو بہت تیزی کے ساتھ اپنی پٹری پر دوڑی چلی جا رہی ہے۔ اس کو کچھ نہیں معلوم کہ آگے کیا ہے۔ حالانکہ آگے کا ٹل ٹوٹ چکا ہے اور وہاں پہنچتے ہی وہ اپنے انجن اور گاڑی سمیت الٹ جائے گی اور اس کے بعد تمام مسافر خواہ وہ اوپر کے درجہ میں سفر کر رہے ہوں یا نیچے کے درجہ میں، سب کے سب ایک ہی ہولناک انجام سے دوچار ہوں گے، حتیٰ کہ اس وقت کوئی خطرہ کی زنجیر بھی نہ ہوگی جس کو کھینچ کر وہ اپنے آپ کو تباہی سے بچا سکیں۔۔۔۔۔ یہ زندگی کے بعد آنے والے روز حساب کا خطرہ ہے جو ہم کو اور ساری دنیا کو درپیش ہے۔ یہ اس اصل زندگی کا مسئلہ ہے جو ہمارے آج کے اعمال کے نتیجے میں ہم کو آئندہ دائمی طور پر گزارنی ہوگی۔ وہ زندگی یا تو بہت خوش گوار ہے یا بے حد دردناک۔

دنیا کے لوگ زندگی میں ہائیڈروجن بم کے خطرہ سے گھبرائے ہوئے ہیں۔ مگر موت کے بعد ہر شخص کے سامنے جہنم کے عذاب کا خطرہ ہوگا جو اس سے بھی زیادہ خوفناک ہے۔ اس خطرہ سے آپ ہی دنیا کو باخبر کر سکتے ہیں۔ سوچئے کہ اس بھاری ذمہ داری کے لئے آپ کیا کر رہے ہیں۔ دنیا نادان ہے اور آپ علم رکھتے ہیں۔ دنیا سے صرف یہ پوچھا جائے گا کہ اس نے خدا کے حکموں کی مطابقت زندگی بسر کی یا نہیں۔ مگر آپ سے اس کے سوا یہ سوال بھی ہوگا کہ جھٹکے ہوئے انسانوں کو راہِ راست پر لانے کے لئے تمہارے کیا کیا۔ دنیا کو صرف اپنا جواب دینا ہوگا اور آپ کو اپنا بھی اور دنیا والوں کا بھی۔

یہ عظیم ذمہ داری تو آپ کے حصہ میں آئی ہے، اس کا خیال بھی آپ کو بے چین کر دینے کے لئے کافی ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ آپ کی راتوں کی نیند اور دن کا سکون حرام ہو جائے۔ دنیا کی لذتوں اور آسائشوں میں آپ کے لئے کوئی دل چسپی باقی نہ رہے۔ آپ یہ بھول جائیں کہ آپ بھی کچھ ضروریات رکھتے ہیں آپ کو صرف یہ یاد رہے کہ دنیا کو آپ کی ضرورت ہے۔ آپ پولیس گھروں، اپنی جائیدادوں اور اپنے اہل و عیال سے زیادہ دنیا کی اصلاح کی فکر ہو۔ آپ کی زبانوں پر ہر وقت اسی کا چرچا ہو کیوں کہ اس کے سوا جو کچھ ہے اس کا چرچا کرنے والے دنیا میں بہت لوگ ہیں آپ ان میں مشغول ہو کر اپنا وقت ضائع کریں گے اور دنیا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکیں گے۔ آپ کے قدم حرکت کریں تو اسی راہ میں حرکت کریں کیوں کہ اس کے سوا جتنے راستے ہیں وہ سب یا تو غلط ہیں یا بے فائدہ۔ آپ کے اوقات یا تو زندگی کی ناگزیر ضروریات فراہم کرنے میں صرف ہوں یا پھر اسی دعوتی مقصد کے لئے جدوجہد کرنے میں۔ آپ کی خواہشات آپ کی تمناؤں اور آپ کی دل چسپیوں کا کوئی دوسرا مزع باقی نہ رہے۔ آپ ہر طرف سے کٹ کر صرف اسی ایک کام کے ساتھ جڑ جائیں۔ آپ کی جانوں اور مالوں پر صرف اسی چیز کا حق ہو۔ غرض آپ اور جو کچھ آپ کے پاس ہے ان سب پر سب سے پہلے اسلامی دعوت کا حق ہو اور اس کے بعد

دوسری چیزوں کا۔ فائر بریگیڈ کی طرح آپ چوبیس گھنٹہ اپنے آپ کو ڈیوٹی پر سمجھیں اور کبھی اس سے غافل نہ ہوں۔ بے شمار انسانوں کی اس بھیڑ میں چند انسان جو حتیٰ کا کام کرنے کے لئے اٹھے ہیں، بااگر وہ لوگ بھی اپنی زندگیوں کو اس کے لئے وقف نہ کریں تو پھر دوسرے لوگ کہاں سے آئیں گے۔

یہاں کروڑوں انسان ہیں جو اس لئے صبح کرتے ہیں کہ دن کے اچالے میں اپنی روزی کمائیں اور اس لئے شام کرتے ہیں کہ دن بھر کی تکان دور کر کے اگلے روز پھر اسی مشغلہ میں جتنے کے قابل ہو جائیں۔ وہ کہیں سفر بھی کرتے ہیں تو وہ سفر با تفریح کے لئے ہوتا ہے یا روزگار کے لئے۔ اس بھیڑ کے اندر دوسرے تمام لوگوں کے خلاف آپ نے ایک نئے راستہ پر چلنے کا ارادہ کیا ہے۔ آپ دنیا کے بجائے آخرت کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس راہ کا تقاضا ہے کہ آپ کی باتیں اس نم نم ہیں ہوں کہ جس دنیا میں آپ رہ رہے ہیں اس پر شیطان اور طاغوت کا غلبہ ہے۔ آپ کی صیغیں اس یاد کے ساتھ شروع ہوں کہ خدا یا جس طرح سورج نے فتنی اور تری کو روشن کیا ہے اسی طرح تو انسانی زندگیوں کو بھی ہدایت سے منور کر دے۔ آپ نکلیں تو خدا کی راہ میں نکلیں اور پھر ہیں تو خدا کے لئے بٹھریں۔ آپ جنت کے امیدوار ہیں۔ پھر آپ کو معلوم ہے کہ جنت کس طرح ملتی ہے۔ جنت میں وہ قدم نہیں جائیں گے جو خدا کی راہ میں گمراہ اور نہ ہونے ہوں۔ جنت کو وہ آنکھ نہیں دیکھی جو خدا کے خوف سے تر نہ ہوئی ہو۔ جنت میں وہ وجود نہیں جائے گا جس نے آخرت کے لئے دنیا کی مصیبتیں برداشت نہ کی ہوں پھر سوچئے کہ آپ کہاں تک ان شرطوں کو پورا کر رہے ہیں۔

ہم اس وقت ایک ہون لاک فوٹاں کے سرے پر کھڑے ہیں۔ جس نے چند مفتوں کے اندر اس ضلع کی تفسیر بنا پانچ سو بیسیوں کو دیران کر دیا ہے اور ہزاروں انسانوں کو متاثر کیا ہے۔ رشہ کا یہ حال تھا کہ دریا کے پانی نے اس کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ جس کے درمیان وہ بائیں جزیرہ بن گیا تھا۔ کنارے کے باشندے اپنے گھروں کو اس طرح خالی کر رہے تھے کہ ان کے گھروں کی گرتی ہوئی دیواریں ان کو نصرت کر رہی تھیں۔ اس سیلاب نے پچھلے سو برس کے تمام ریکارڈ توڑ دئے۔ شہر کے گرد ایک بہت بڑا باندھ ہے جو ۱۸۷۱ کے تاریخی سیلاب کے بعد بنایا گیا تھا۔ اسی باندھ سے اس وقت شہر کی قسمت بندھی ہوئی تھی جس کے دوسری طرف شہر کی عام سطح سے کمی گزرا اور پانی لگا ہوا تھا۔ ہر گھر میں اسی کا چرچا تھا اور ہر شخص کی زبان پر اسی کا تذکرہ تھا۔ یہاں تک کہ ۲۶ اور ۲۷ جولائی ۱۹۵۵ کی درمیانی رات کو کلکٹر کی طرف سے بذریعہ لاڈ اسپیکر یہ اعلان ہوا کہ:

”لاٹ ٹنگی کا باندھ ابھی ٹوٹنا چاہتا ہے آپ لوگ اپنی جانوں کو بچانے کے لئے اونچی جگہوں پر چلے جائیں“  
اس وقت رات کے ایک بجے تھے۔ سارا شہر جاگ اٹھا اور عیسائی بھین گئی۔ لوگ اپنے کچے اور بچے گھروں سے نکل کر باندھ کی طرف دوڑے اور سیکڑوں آدمیوں نے پھاؤڑا اور بوریالے کر اس جگہ نئی ڈالنی شروع کر دی جہاں سے باندھ پھٹ گیا تھا۔ ایسے ایسے لوگ جنھوں نے شاید زمین پر بھی ننگے پاؤں قدم بھی نہ رکھا ہو گا۔ وہ سردوں پر مٹی کا ٹوکرا لے کر ڈھوپے تھے۔

۵۰ اشارہ ہے اس تاریخی سیلاب کی طرف جس نے ۱۹۵۵ کی برسات میں مشرقی ہندوستان کو زبردست نقصان پہنچایا۔

درجنوں بیٹھکیس کی روشنی میں ساری رات کام ہوا اور دوسرے دن دوپہر تک ہوتا رہا۔ بالآخر نچھینر نے کہہ دیا کہ اب باندھ قابو سے باہر چکا ہے۔ ۱۲ بجے دن کے بعد باندھ ٹوٹ گیا اور دم کے دم میں پانی سڑکوں پر پینے لگا۔ سارے شہر میں کھرام پھیل گیا۔ دکائیں بند ہو گئیں۔ لوگ اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف بھاگ رہے تھے اور پانی ان کے پیچھے اس طرح دوڑ رہا تھا گویا ان کا پیچھا کر رہا ہے۔ زندگی کے مسائل سمٹ کر بس سیلاب کے گرد جمع ہو گئے اور چند دنوں کے لئے شہر میں قیامت کا منظر دکھائی دینے لگا۔

اس سیلاب میں ہمارے لئے بہت سی نصیحتیں اور عبرتیں ہیں مگر میں اس وقت جس چیز کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ کہ ایک اس سے بھی زیادہ جو نیک طوفان نہ صرف ایک صلح کو بلکہ ساری دنیا کو گھیرے ہوئے ہے اور تمام انسانوں کی زندگی اس کی زد میں ہے۔ سیلاب کا خطرہ ایک ایسا خطرہ ہے جس کو ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور سب کو اسی طرح معلوم ہے کہ وہ ان کی زندگی کو کیا نقصان پہنچا سکتا ہے مگر حق کو اختیار نہ کر لے گا جو خطرہ ہے وہ کسی کو نظر نہیں آتا، اور نہ کوئی شخص یہ جانتا ہے کہ اس کی زندگی کو کیا نقصان پہنچنے والا ہے۔ سیلاب کے خطرہ سے آگاہ کرنے کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ لاؤڈ سپیکر کے ذریعہ ایک اعلان کر دیا جائے۔ مگر جس خطرہ سے دنیا کو آگاہ کرنا چاہتے ہیں اس کا سمجھنا بھی دنیا کے لئے مشکل ہے۔ اُن مشاغل کا نظریہ اضافیت اور ایٹم کی حقیقت لوگوں کو سمجھائی جا سکتی ہے مگر یہ سمجھنا ناممکن ہے کہ حق سے بے نیاز ہو کر وہ ایک ایسے جوالا کھی پہاڑ کے دہانہ پر بیٹھے ہوئے ہیں جو کسی کی بھی وقت پھٹ کر ان کا خاتمہ کر سکتا ہے۔

ہمارا کام محض اس طرح نہیں ہو سکتا کہ اپنے پیغام کو کسی نہ کسی طرح لوگوں کے کان میں ڈال دیں بلکہ ہمیں اس کو بدل بنا کر ان کے سامنے رکھنا ہو گا اور اس کے لئے لمبی مدت تک زبردست جدوجہد کرنی ہوگی۔ ایک ایسی چیز جو وقت کے پیمانوں کے لحاظ سے سب سے زیادہ بے وزن ہے اس کو اس انداز میں پیش کرنا ہو گا کہ وہ دوسری تمام چیزوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ باوزن نظر آنے لگے یہاں تک کہ لوگ اس پر سوچنے کے لئے مجبور ہو جائیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھنے لگیں کہ اس ایک راستے کے سوا تمام راستے باطل غلط اور تباہی کی طرف لے جانے والے ہیں۔ اس کے لئے ہمیں اپنے دماغ اور اپنے جسم کی ساری قوتیں صرف کرنی ہوں گی۔ اپنے اوقات اور اپنی کمائیوں کا سب سے بڑا حصہ اس مقصد عظیم کی نذر کرنا ہو گا۔ اور یہ سب کچھ کسی ایک رات اور کسی ایک دن کے لئے نہیں بلکہ ساٹھ سال کے لئے اور ساری عمر کے لئے کرنا ہو گا۔ ہمیں اس مقصد کے لئے قربان ہو جانا پڑے گا اور اپنی زندگیوں کو اس راہ میں کھپا دینا ہو گا۔ جیسی یہ ممکن ہے کہ لوگ ہمارے پیغام سے واقف ہوں اور آئے والے خطرہ سے آگاہ ہو کر اس سے بچنے کا سامان کر سکیں۔ پھر کون ہے جو حق کے لئے قربان ہوتا ہے۔ کون ہے جو دنیا کو تباہی سے بچانے کے لئے جان کی بازی لگا سکتا ہے۔ کون ہے جو اس کو تھوڑا سا ہٹا سکتا ہے جو کہ اس کی نظروں کے سامنے ہے تاکہ وہ اس کو پاسکے جو کہ اس کی نظروں سے اوجھل ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اس کا حوصلہ کر سکیں کیوں کہ وہی انسانیت کا اصل جوہر ہیں اور وہی ہیں جو زندگی کی اصل کامیابی کے حق دار ہوں گے۔ (مطبوعہ سہ روزہ دعوت ۵ ستمبر ۱۹۵۵)

تقریر ماہانہ اجتماع جماعت اسلامی، بمقام سیدھا سلطان پور (اعظم گڑھ) ۵ اگست ۱۹۵۵

دفتر کے صحن میں دوڑنے کی آواز نے مجھے بڑھکادیا، دیکھا تو ہا کر ہاتھ ملی اخبار لے بھاگا چلا آرہا ہے۔ یہ اس کا روزانہ کا معمول ہے۔ صبح کا اخبار اول ترین وقت میں تمام خریداروں کے پاس پہنچانے کا اس کو اتنا خیال ہے کہ وہ دوڑتا ہوا چلتا ہے۔ اور اگر اخبار لینے کے بعد اس سے کوئی سوال کیا جائے تو وہ ٹھہر کر اس کا جواب نہیں دے گا بلکہ واپس بھاگتے ہوئے کہتا چلا جائے گا۔ وہ دوڑ رہا ہے تاکہ وہ بھاگتے ہوئے وقت کو کپڑے، تاکہ وہ وقت کے پیچھے نہ رہ جائے۔ یہ دنیا کے لئے انسان کی دوڑ دھوپ کی ایک مثال ہے جس کو آپ اپنے قریب ترین دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں اگر آپ کا حال یہ ہو کہ آپ صبح کئی چائے "میں طویل وقت صرت کرنے کے بعد اپنے ساتھیوں کے درمیان تے کھلتے باتیں کرتے ہوئے نہایت اطمینان کے ساتھ اخبار کی آمد کا انتظار کر رہے ہوں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ آخرت کے اقرار میں اتنے سنجیدہ بھی نہیں ہیں جتنا وہ شخص اپنے پیشے میں سنجیدہ ہے جس کا آپ انتظار کر رہے ہیں۔ آپ مسلمان ہیں، آپ اسلام کے ذمہ ہیں، لیکن اگر صورت حال یہ ہو تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کا مسلمان ہونا آپ کی حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ آپ کی اسلامی دعوت محض اس سے ایک رعایتی وابستگی کا نتیجہ ہے یا زیادہ سے زیادہ وہ ایک ذہنی موضوع ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ آخرت کے لئے اس سے زیادہ بیتاب ہوتے جتنا ایک دنیا پرست دنیوی فائدوں کے لئے بے تاب ہوتا ہے۔ آخرت کی طلب میں آپ اس سے زیادہ تیز دوڑنے کی کوشش کرتے جتنا کوئی شخص اپنی ملازمت اور کاروبار کے لئے دوڑتا ہے، اپنے وقت اور اپنی صلاحیتوں کے استعمال میں آپ اس سے زیادہ مستعد ہوتے جتنا کہ ایک اخباریچنے والا اپنے کام میں نظر آتا ہے۔

اسلام آدمی کو زندگی کی سب سے بڑی کامیابی کے لئے بلاتا ہے۔ جس کے دل میں یہ بات اتر چکی ہو، کیسے ممکن ہے کہ وہ شخص غیر متعلق کام میں یا کتر درجے کے مقاصد میں اپنا وقت ضائع کرے، اسلام ہم کو موجودہ زندگی کی غفلتوں کے بدلے بے پناہ عذاب سے ڈراتا ہے۔ جو شخص فی الواقع اس خبر پر ایمان لایا ہو کیسے ممکن ہے کہ آپ اس کو بے فکری کے ساتھ قہقہہ لگاتا ہوا پائیں۔ اسلام کہتا ہے کہ تمہارے اوپر ایک عظیم خدا ہے جو ہر وقت تمہیں دیکھ رہا ہے۔ جو شخص اس حقیقت کو مانتا ہو۔ کیسے ممکن ہے کہ وہ ایک لمحے کے لئے بھی ایسے مشاغل میں مصروف ہونا پسند کرے جس کی خدائے ذوالجلال کے نزدیک کوئی قیمت نہ ہو، اسلام کہتا ہے کہ تمہاری زندگی بالکل غیر یقینی ہے، کسی بھی وقت موت کے فرشتے تمہاری گرفتاری کے لئے پہنچ سکتے ہیں۔ جو شخص حقیقی معنوں میں اس انتہائی نازک صورت حال کا احساس رکھتا ہو، کیسے ممکن ہے کہ وہ روزانہ اپنے اوقات کا ایک حصہ ایسے مشاغل میں صرف کرتا رہے جس کا طلب آخرت سے کوئی تعلق نہیں ہے جو شخص خدا سے ڈرتا ہو اس کے لئے ممکن نہیں ہے کہ ایک کام کو مہینوں اور سالوں کرتا رہے اور اس کو احساس نہ ہو کہ وہ ایک غلطی کو دہرا رہا ہے۔

"کیا یہی وہ تصویر ہیں جو خدا اور آخرت پر ایمان لانے کے بعد بنتی ہیں؟ یہ فقرہ اکثر ایک دردناک آہ کے ساتھ میری زبان سے اس وقت نکل جاتا ہے جب میں اپنے گرد و پیش کے لوگوں کو دیکھتا ہوں۔ انسان کے لئے اس کے سماجی منافقت

آخری اتفاقوں سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ خدا کی مرضی کے لئے سرگرم ہونے سے زیادہ اس کو یہ بات محبوب ہے کہ وہ اپنے ذوق کی تسکین اور اپنی عادتوں کی تکمیل میں لگا رہے۔ وہ اپنی زندگی کے مقدرہ نقشہ کو نہیں بدلی سکتا، خواہ اس کی وجہ سے اس کی عبادتیں ناقص ہو جائیں، خواہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو ٹھیک ٹھیک انجام نہ دے سکے، خواہ اس کو بالآخر اپنی بے حسی اور ناکوچھپانے کے لئے جھوٹے عذرات کا سہارا لینا پڑے۔

یہ شکایت مجھے صرف ان لوگوں سے نہیں ہے جو عہد نامہ ماحول میں پرورش پا کر نکلے ہیں۔ وہ لوگ جو ”دیندار“ کہے جاتے ہیں۔ جن کی طرف اسلامی مسائل معلوم کرنے کے لئے رجوع کیا جاتا ہے۔ ان کا حال بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے چند دن پہلے میں ایک راستے سے گزر رہا تھا کہ ایک پر جوش آواز میرے کان میں آئی۔ ”ہر آدمی کی زبردست خواہش ہوتی ہے کہ اپنی اولاد کو پھلتا پھولتا دیکھے اس سے دل کو بڑی تسکین ہوتی ہے“ دیکھا تو ایک بزرگ ایک دکان میں بیٹھے تقریر کر رہے تھے۔ چہرے پر حائرانہ ان کے دین دار ہونے کی علامت تھی اور زبان اور وضع قطع بتا رہی تھی کہ یقیناً کوئی عالم ہوں گے۔ میں نہیں کہتا کہ یہ کوئی ناچائز خواہش ہے۔ مگر حجب میں دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں کے اندر یہ تمنا تو بہت زیادہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کو پھلتا پھولتا دیکھیں مگر اسلام کو پھلتا پھولتا دیکھنے کی ترپ ان میں باقی نہیں ہے، تو یہ جائز خواہش بھی مجھے ایک جرم معلوم ہونے لگتی ہے۔ ایک بزرگ کو میں نے ایک مرتبہ دیکھا کہ وہ ایک نوجوان کو اس بات پر تنبیہ کر رہے تھے کہ وہ نماز کے بعد دعا کے لئے نہیں ٹھہرتا بلکہ سلام پھیرنے کے بعد فوراً اٹھ کر چلا جاتا ہے۔ بے شک یہ نوجوان کی غلطی تھی۔ مگر میں جانتا ہوں کہ خود ان بزرگ کا یہ حال ہے کہ صبح کی اور دوپہر کی نیند اکثر انھیں فجر اور ظہر کی نمازوں میں دقت پر مسجد پہنچنے نہیں دیتی۔ شام کی گفتگو میں وہ کبھی کبھی اتنا مصروف ہوتے ہیں کہ مسجد اس وقت پہنچتے ہیں جب امام ایک رکعت پوری کر چکا ہوتا ہے۔ آپ کو ایسے کہنے ”عالم دین“ ملیں گے جن کے سامنے اگر دکن منکم امتہ میل عون الی الخیر کا ترجمہ ”تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہئے جو لوگوں کو تیر کی طرف بلائے“۔ کر دیا جائے تو وہ اس پر دو گھنٹے بحث کریں گے کہ یہاں جوت ”تبھیضیہ“ نہیں بلکہ ”بیانیہ“ ہے۔ یعنی آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ”تم کو ایسا گروہ بننا چاہئے جو لوگوں کو تیر کی طرف بلائے“۔ (نہ یہ کہ تم میں سے۔۔۔) مگر ان حضرات کے ساتھ آپ جینیوں اور سالوں زندگی گزاریں، آپ یہ نہ دیکھیں گے کہ ان کے اندر فی الواقع دعوت الی الخیر کی کوئی واقعی ترپ پائی جاتی ہے۔ وہ آیت میں عموم ثابت کرنے کے لئے قابلیت صرف کریں گے۔ مگر اس عموم کو اپنی ذات تک پہنچانے کی ضرورت نہیں سمجھیں گے۔ صلوٰۃ و سنی کا ترجمہ اگر ”بیچ کی نماز“ یا ”عصر کی نماز“ کر دیکھے تو وہ آپ کے ادب پر جہات کا فتویٰ صادر کر دیں گے۔ وہ اصرار کریں گے کہ قرآن میں جو صلوٰۃ و سنی کا لفظ آیا ہے اس سے مراد ”بہترین نماز“ ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس سے مراد کوئی ایک نماز نہیں بلکہ ساری نمازیں ہیں۔ مگر ان کی اپنی نمازوں کو دیکھتے تو آپ یہ نہ پائیں گے کہ وہ اپنی نماز کو ”بہتر“ بنانے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ دوسروں پر تبلیغ کرتے ہوئے وہ نہایت جوش کے ساتھ اس واقعہ کو بیان کریں گے کہ:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کو لے کر غزوہ بدر کے لئے نکلے، دوسری طرف مشرکین کا لشکر تھا۔ آپ نے فرمایا،



دو میں شیطان نے چند ایسے الفاظ جمیا کر دیے ہیں جن کے ذریعہ کسی بھی صحیح ترین تنقید کو نہایت آسانی سے رد کیا جاسکتا ہے۔ — ”یہ شدت پسندی ہے۔“ ”یہ تمھارا انتہا پسندانہ ذوق ہے“ ”تم یک رُنے نماز میں سوچتے ہو“ ”تم اعتدال کے راستے سے ہٹ گئے ہو“ وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ آپ کے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہیں ہوگا۔ کیوں کہ خدا کے رسول پہلے ہی اعلان فرمایا ہے کہ **اللّٰہُ یُبْئِسُہَا!**

مگر یاد رکھئے آج آپ ایک ناصح کو ان جوابات سے خاموش کر سکتے ہیں۔ مگر خدا کے یہاں اس قسم کے جوابات ہرگز کافی نہ ہوں گے۔ وہاں تو آپ کی پوری زندگی کا بخیہ ادھیڑ کر رکھ دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ تم خود دیکھ لو کہ دنیا کی زندگی میں تم جن مشاغل میں مصروف تھے ان کے پیچھے کیا کیا محرمات کام کر رہے تھے۔

میرے ایک ساتھی نے ایک مرتبہ بہت عمدہ بات کہی — ”آخرت میں خدا کا انعام اسی کو ملے گا جس نے دنیا میں خدا کے انعام کو پالیا ہو۔“ اس بات پر غور کیجئے تو اس میں نصیحت کے بہت سے پہلو چھپے ہوئے ہیں۔ آپ اپنے کو مسلمان کہتے ہیں، آپ دین حق کے علم بردار ہیں، یہ دراصل اس بات کا اعلان ہے کہ آپ خدا کی جنت کے امیدوار ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ انعام ”جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا“ وہ محض دعویٰ اور خوش گمانیوں کے ذریعہ تو کسی کو نہیں مل سکتا۔ یہ انعام صرف اس کے لئے ہے جس نے دنیا میں اپنی آخرت طلبی کو نمایاں طور پر ثابت کر دیا ہو، جس نے اپنے مسلسل رویے سے یہ دکھا دیا ہو کہ دوسرے انسانوں کے مقابلے میں وہ اس کے پانے کا استحقاق رکھتا ہے۔ جب دوسرے لوگ دنیا کی لذتوں میں کھوسے ہوئے تھے تو وہ خدا کے انعام کے تصور میں اتنا محو ہوا کہ اسے دنیا کی لذتیں بھول گئیں۔ جب دوسرے لوگ اپنے ذوق کو تسکین دینے میں مصروف تھے تو وہ خدا کی رضا حاصل کرنے کے لئے تڑپ رہا تھا، جب دوسرے لوگ سوتے تھے تو وہ جاگتا تھا، جب دوسرے آرام کرتے تھے تو وہ تکلیف اٹھاتا تھا، جب دوسرے لوگ مہنی اور تفریح میں دل بہلا رہے تھے تو وہ آنسو بہا رہا ہوتا تھا۔ مختصر یہ کہ جب دوسرے لوگ دنیا کی زندگی میں اپنے آپ کو گم کئے ہوئے تھے تو وہ آخرت کی زندگی کے لئے اپنا ایک ایک لمحہ صرف کر رہا تھا۔

جنت کا تعلق ہونا دوسرے لفظوں میں آخرت میں کسی کا ممتاز مقام حاصل کرنا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ دنیا میں صرف وہی شخص کسی ممتاز مقام کو پاتا ہے جس نے اس کے لئے بے پناہ جدوجہد کی ہو۔ ٹھیک اسی طرح آخرت کے درجات عالیہ بھی وہی لوگ پائیں گے جنھوں نے اپنے آپ کو اس کے لئے کھپا دیا ہو۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ اپنی سطحی زندگی کے نتیجے میں وہ آخرت کے انعامات کو حاصل کرے گا تو یہ محض خوش فہمی ہے۔ ٹھیک دیکھی ہی خوش فہمی جیسے کوئی شخص سمجھ لے کہ وہ بستر پر بیٹھ بیٹھ وہ مقام حاصل کر سکتا ہے جب کہ دنیا اسے ”فاتح ایورسٹ“ کے نام سے پکارے اور اس کو وہ اعزازات نصیب ہوں جو بھیری اور تین رنگ کو بھیری جدوجہد کے بعد حاصل ہوئے۔

۱۸۴۲ میں انگریزوں کے دیہات میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ پیدائش کے وقت وہ اتنا کمزور تھا کہ دائیوں نے اس کی زندگی کی طرف سے مایوسی ظاہر کی۔ اس کا کمزور حفاظت کی خاطر چڑھے کی پٹی سے لپیٹ دیا گیا۔ اس کے بعد جب وہ بڑا ہو کر ہائی اسکول پہنچا تو وہ اپنے ساتھیوں میں سب سے پیچھے تھا۔ مگر وہی کمزور لڑکا جب پچاسی سال کی عمر میں مرا تو وہ نیوٹن کے

پر عظمت نام سے مشہور ہو چکا تھا۔ نہ صرف انگلینڈ میں اس کو بلند ترین اعزازات حاصل ہوئے بلکہ ساری دنیا میں اپنی ذہنی عظمت کا اس نے ایسا سکہ بٹھایا کہ اس کے مرنے کے سوسال بعد جب دورِ برین مطالعہ میں سائنس دانوں نے دیکھا کہ سیارہ یورسے نس نیوٹن کے قانونِ تجاذب کے بتائے ہوئے راستے سے کچھ ہٹا ہوا ہے تو انھوں نے نیوٹن کے اصول کی غلطی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ یہاں کوئی اور سیارہ ہونا چاہئے جس کی کشش سے اس کی رفتار میں یہ فرق پیدا ہوا ہے۔

نیوٹن کو یہ عظمت کیوں حاصل ہوئی اس کا جواب خود اس کی زبان سے سنئے۔ ایک مرتبہ اس کے کارناموں کی تقریریں کی گئی تو اس نے کہا:

“I had no special sagacity — only the power of patient thought”  
 یعنی میرے اندر کوئی خصوصی قابلیت نہیں ہے۔ مجھے جو کچھ ملا وہ صرف اس وجہ سے ملا کہ میں نے کائنات کو سمجھنے کے لئے اٹھک جھوجھ سے کام لیا ہے۔ اپنی مشہور کتاب (Principia) کی تیاری کے دوران میں اٹھارہ مہینے تک اس کا یہ حال تھا کہ وہ گھنٹوں بے حس و حرکت پڑا سوچتا رہتا۔ اس کے بعد یکا یک اپنی ڈسک پر جا کر کھڑا ہو جاتا اور گھنٹوں مسلسل لکھتا رہتا۔ اس کو اتنا بھی ہوش نہیں رہتا تھا کہ قریب کی کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھ جائے۔ اس کے سکرٹری کی رپورٹ ہے کہ اس دوران میں بہت کم ایسا ہوا کہ وہ دو بجے سے پہلے بستر پر گیا ہو اور بعض اوقات تو پانچ اور چھ بج جاتے تھے۔ کھانا بھی وہ اکثر بھول جاتا تھا۔ اس کی زندگی کی ضروریات بہت محدود تھیں۔ ایک مرتبہ اس سے پوچھا گیا کہ تم سگریٹ کیوں نہیں پیتے، اس نے جواب دیا:

“Because I do not want to acquire any new necessities”.

یعنی میں سگریٹ اس لئے نہیں پیتا کہ اس کی وجہ سے میری ضروریات زندگی میں خواہ مخواہ ایک نئی ضرورت کا اضافہ ہو جائے گا۔  
 ولیم ہرشل William Herschell ایک جرمن سائنس داں گزرا ہے۔ اس نے فلکیات کے مطالعہ میں انسان کے علم کو بہت آگے بڑھایا۔ اس کا حال یہ تھا کہ معاشی تنگی کی وجہ سے اسکول کے بعد وہ اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکا اور ایک ملازمت کرنی۔ لیکن صحت کی خرابی کی وجہ سے انیس سال کی عمر میں یہ ملازمت بھی چھوڑنی پڑی۔ اس کے بعد اس نے اپنے خاندانی پیشے کو اختیار کیا اور دوا لکھ جانے لگا۔ ساھی دوران میں اس کو فلکیات کے موضوع پر ایک کتاب ملی۔ اس کتاب کو اس نے بہت فور سے پڑھا۔ اس کے بعد ہرشل کو ستاروں کے مطالعہ سے گہری دل چسپی پیدا ہو گئی۔ اس کا یہ شوق اتنا بڑھا کہ کبھی کبھی رات کے وقت جب اس کی ٹولی ساز و نمونہ میں مصروف ہوتی تھی وہ مجلس چھوڑ کر تھوڑی دیر کے لئے باہر نکل جاتا تاکہ آسمان پر جگمگاتے ہوئے ستاروں کی ایک جھلک دیکھ آئے۔

ستاروں کے مطالعہ کے لئے دورِ برین ضروری تھی۔ مگر یہ اٹھارھویں صدی کا زمانہ تھا جب کہ دورِ برین ابھی جلد ہی ایجاد ہوئی تھی اور نہ صرف یہ کہ ناقص تھی بلکہ اس کا ملنا بھی آسان نہیں تھا۔ ہرشل نے خود اپنی دورِ برین بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے متعلق فنی واقفیت حاصل کرنے کے لئے اس نے ریاضی پڑھنی شروع کی اور لمبی محنت کے بعد خود اپنے ہاتھ سے دورِ برین



خام خیالی ہوگی اگر کوئی شخص سمجھ لے کہ محض سطحی قسم کے عمل کے ذریعہ وہ اسے حاصل کر لے گا:

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُدْخَلُوا الْجَنَّةَ دَلَّامًا يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ خَلَقُوا إِبْرَاهِيمَ وَآلَهُمَا وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ  
 الَّذِينَ آمَنُوا وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ  
 وَمَنْ يَتَّبِعْ أَهْلَ الْبَيْتِ وَاللَّهُ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا مِمَّا فِيهَا وَيُدْخِلْهُ الْجَنَّةَ وَمِنْهَا يُخْرِجُ الْبَشَرَ لِيُجْزِيَ الْأَشْقَاءَ  
 مَعَهُمْ نَسَبًا مِمَّا فِيهَا وَيُدْخِلُ الْجَنَّةَ الَّذِينَ آمَنُوا فِيهَا  
 وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ

بقرہ ۲۱۳

اور اس کے ساتھی اہل ایمان بیکار ٹھکے کہ خدا کی مدد کب آئے گی۔ سن لو! ایسے لوگوں کے لئے خدا کی مدد قریب ہے۔

آخر میں آپ کو میں ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں جو پچھلے دس سال سے میری یادداشت کا بہترین حصہ رہا ہے یہ ایک انگریز مسٹر آرنلڈ کا واقعہ ہے جو علی گڑھ میں فلسفہ کے پروفیسر تھے۔ ۱۸۹۲ء میں جب مولانا شبلی نے قسطنطنیہ کا سفر کیا تو جہاز میں پورٹ سعید تک مسٹر آرنلڈ کا بھی ساتھ رہا۔ مولانا شبلی مکھتے ہیں:

۱۰۔ امریکی کی صبح کو میں سوئے سے اٹھا تو ایک ہم سفر نے کہا کہ جہاز کا انجن ٹوٹ گیا۔ میں نے دیکھا تو واقعی کینٹان اور جہاز کے ملازم گھبرائے پھرتے تھے اور اس کی درستگی کی تدبیریں کر رہے تھے۔ انجن بائیں بے کار ہو گیا تھا اور جہاز نہایت آہستہ آہستہ ہوا کے سہارے چل رہا تھا۔ میں سخت گھبرایا اور نہایت ناگوار خیالات دل میں آنے لگے۔ اس خطاب میں اور کیا کر سکتا تھا۔ دوڑا ہوا مسٹر آرنلڈ کے پاس گیا۔ وہ اس وقت نہایت اطمینان کے ساتھ کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ کو خبر بھی ہے۔ بولے کہ ہاں انجن ٹوٹ گیا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کو کچھ اضطراب نہیں۔ بھلا یہ کتاب دیکھنے کا موقع ہے۔ فرمایا کہ جہاز کو اگر برباد ہی ہونا ہے تو یہ تھوڑا سا وقت اور بھی قدر کے قابل ہے اور ایسے قابل قدر وقت کو رائیگاں کرنا بائیں بے عقلی ہے۔“ سفر نامہ روم و مصر و شام صفحہ ۱۲

سمندر کی لہروں کے درمیان جہاز کی یہ غیر یقین حالت آٹھ گھنٹے قائم رہی۔ آٹھ گھنٹے کا یہ وقت مسٹر آرنلڈ کے لئے جو حیثیت رکھتا تھا مومن کے لئے وہی حیثیت اس کی پوری زندگی کی ہے۔ آپ ہر وقت اس خطرے میں مبتلا ہیں کہ اچانک آپ کی موت آجائے۔ ہر لمحہ آپ کے لئے زندگی کا آخری لمحہ ہے۔ اگر آدمی کو اس بات کا واقعی احساس ہو جائے تو وہ اسی طرح ہمدرد مشغول نظر آئے گا جیسے امتحان میں بیٹھا جو ادوہ طالب علم جس کا وقت ختم ہو رہا ہو اور ابھی اسے کئی سوال کرنے باقی ہوں۔ لیکن اگر آپ غفلت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اگر آپ اپنے وقت کی اہمیت نہیں سمجھتے تو اس کے صحیح یہ ہیں کہ آپ کو اس نازک صورت حال کا احساس نہیں ہے جس میں آپ کی زندگی کا جہاز گھرا ہوا ہے۔ آپ موت سے نہیں ڈرتے آپ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ سوچئے کہ آپ کی زندگی آپ کے بارے میں کس چیز کا ثبوت دے رہی ہے (زندگی بیخ لاٹل) ۱۳۸۱

اسلامک یوتھ آرگنائزیشن (رام پور) کے اجتماع میں کی گئی تقریر۔ ۱۳ جولائی ۱۹۶۱

## خدمت دین کی مشکلات

پندرہ سال پہلے کا ایک واقعہ مجھے یاد آ رہا ہے۔ روان نامی ہستی کے باہر ایک باغ میں جماعت اسلامی کا منظمی ماہانہ اجتماع ہو رہا تھا۔ ظہر کا وقت تھا۔ افغان ہو چکی تھی، ایک بڑے درخت کے نیچے فرش پکھا ہوا تھا جہاں کچھ لوگ سنتیں پڑھ رہے تھے اور کچھ نماز کے وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک حادثہ پیش آیا۔ اجتماع کے بائیں تریب ایک بڑا سا گڑھا تھا جس کے عین کنارے سے راستہ گزرتا تھا۔ اس راستہ پر ایک بیل گاڑی جا رہی تھی۔ جیسے ہی وہ گڑھے کے کنارے پہنچی اس کا ایک طرف کا پیہر پھسل گیا اور پوری گاڑی کروٹ ہو کر گڑھے میں اس طرح گر گئی کہ ایک پیہر اوپر کھڑا تھا اور دوسرا پیچے دبا ہوا تھا۔ جیسے ہا ہم میں سے کچھ لوگوں کی نظر اس پر پڑی، وہ فوراً اس کی مدد کے لئے دوڑ پڑے۔ گاڑی سامان سے لدی ہوئی تھی۔ بیل بھی اس کے ساتھ جوئے میں پھنسے ہوئے تھے۔ بظاہر سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ چند لوگ کیسے اس مسئلہ کو حل کر سکیں گے۔ مگر یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا، بلکہ فی الفور اقدام کرنے کا وقت تھا۔ آنے والے فوراً اپنے کام میں لگ گئے۔ کچھ نے نیچے سے زور لگایا اور کچھ نے اوپر سے پکڑ کر گاڑی کو اٹھانا شروع کیا۔ میں ان خوش نصیبوں میں تھا جو گاڑی کو نیچے سے اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس کے بعد ایک حیرت انگیز واقعہ پیش آیا۔ یکایک ہم نے دیکھا کہ گاڑی اٹھا کر اوپر رکھ دی گئی ہے۔ واقعی ایسا ہی ہوا۔ جو چند آدمی اس کام میں لگے تھے ان سب کا متفقہ احساس تھا کہ گاڑی ہم نے نہیں اٹھائی ہے، بلکہ وہ تو کسی اور نے اٹھا کر کھڑی کر دی ہے۔ نیچے ہاتھ دینے والوں کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اوپر سے کوئی اس کو کھینچے چلا جا رہا ہے۔ اور جو لوگ اوپر تھے ان کو ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا گاڑی نیچے سے اٹھتی چلی آ رہی ہے۔

یہ واقعہ جو پچھلے پندرہ سال سے میری یادداشت کا بہترین سرمایہ رہا ہے اس کو میں نے قصہ خوانی کے طور پر آپ کے سامنے پیش نہیں کیا ہے، خدا مجھ کو اس سے بچائے کہ میں قصہ خوانی کو اپنا طریقہ بناؤں اور قصے سناتے میں آپ کا وقت ضائع کروں۔ میں نے اس کو صرف اس لئے بیان کیا ہے کہ آپ اس پر غور کریں۔ کیوں کہ اس کے اندر ہمارے لئے بڑی عبرت کا سامان ہے، یہ واقعہ ہمارے لئے اس بات کا پیغام ہے کہ خدا انسانوں کی مدد کرتا ہے، یہ ہمارے لئے خدا کی مدد کا ایک ذاتی تجربہ ہے۔ تاریخ میں ایسے بے شمار واقعات ہم پڑھتے ہیں۔ مگر یہ ایک ایسا واقعہ ہے جو ہماری اپنی زندگی میں پیش آیا ہے جس کا ہم نے براہ راست تجربہ کیا ہے۔ لدی ہوئی اور بھینسی ہوئی گاڑی کا محض چند آدمیوں کے ہاتھ لگانے سے دم بھر میں اٹھ کر کھڑی ہو جانا، یقیناً خدا کی مدد کی وجہ سے تھا۔ اگر ہم کو وہ آنکھیں حاصل ہوتیں جن سے غیر مادی حقیقتوں کو دیکھا جاسکے تو ہم دیکھتے کہ عین اس وقت جب کہ چند کمزور آدمی محض خدا کے بھروسے پر بائیں جانب لٹے گاڑی کا کام کے لئے دوڑ پڑے تو اسی وقت آسمان سے فرشتوں کی بھی ایک فوج اتر آئی اور اس نے ان کی آن میں وہ کام کر دیا جو ہمارے کم زور ہاتھوں سے نہیں ہو سکتا تھا۔

دوستو! اسی طرح سے ایک اور گاڑی بھینسی ہوئی ہے۔ یہ دین کی گاڑی ہے۔ اسلام کی گاڑی چلتے چلتے حالات

میں بچیں گئی ہے۔ پاسانوں کی غفلت سے باطل اس پر حملہ آور ہو گیا ہے۔ زمین کی خرابی سے اس کے پھلے اپنی جگہ سے ہٹ گئے ہیں۔ اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ آپ اس کے لئے دوڑیں۔ آپ اس کو اٹھانے کے لئے اپنے وجود کو لگا دیں۔ آپ کی زندگی کا بہترین مصروفیت، آپ کے اوقات کا اعلیٰ ترین استعمال اس وقت اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ یہی ہے کہ آپ خدا کے دین کی کاٹری کو اٹھانے میں لگے ہوئے ہوں۔ اس زمین پر انسان کے لئے اس سے بڑی اور کوئی سعادت نہیں۔ خدا کے دین کا مظلوم ہونا ہمارے لئے سعادت و کامرانی کا بہترین موقع فراہم کرتا ہے۔ یہ اگرچہ دین اور اہل دین کے لئے انتہائی سخت حالت ہے، مگر انہیں سخت حالات میں ہمارے لئے اس سب سے بڑی کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے جس کی اس دنیا میں کوئی شخص تمنا کر سکتا ہے۔ انسان کے لئے اس سے بڑی اور کوئی سعادت نہیں کہ وہ خدا کے کام میں لگا ہو۔ ہمارا عاجز اور کمزور وجود خدا کی خدمت میں مصروف ہو۔ کیا اس سے بڑی بھی کوئی بات ہو سکتی ہے جس کی ہم آرزو کریں۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوتی اس سے بڑی بات یہ ہے کہ خدا کی مدد کے لئے اٹھنا خود ہم کو خدا کی مدد کا مستحق بنانا ہے۔ جب بندہ خدا کے کام میں مصروف ہوتا ہے تو وہ تنہا نہیں ہوتا، بلکہ خود خدا بھی اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ خدمت دین وہ بہترین وقت ہے جب بندے کو خدا کی محبت حاصل ہوتی ہے۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ لمحات کس قدر قیمتی ہیں جب بندہ خدا کے ساتھ چل رہا ہو، جب وہ خدا کے سایہ میں سفر کر رہا ہو، جب خدا کے فرشتے اس کے ہم رکاب ہوں، جب وہ براہ راست خدا کی نگرانی میں آگیا ہو۔ آپ جانتے ہیں کہ ایک معمولی آدمی کو اگر کسی حاکم کی محبت حاصل ہو جائے تو وہ پھولا نہیں سنا۔ پھر خدا کی محبت اور اس کی مدد کا کیا ٹھکانا۔

دین آج جس چیز کا تقاضا کر رہا ہے، اسے آپ ہی کو پورا کرنا ہے۔ یہ کام آپ کو انجام دینا ہے۔ خدا کی طرف سے آپ کو ایمان کی توفیق ملنا اور آخری رسول کی امت میں شامل کیا جانا، گو یا خدا کی طرف سے آپ کو اس کام پر مقرر کیا جانا ہے۔ آپ کا ایمان، اس کام پر آپ کے تقرر کا نشان ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ جب کسی شخص کو کسی کام پر مقرر کیا جاتا ہے تو اس کے لئے اس کی ڈیوٹی کے مطابق تمام انتظامات بھی کر دئے جاتے ہیں۔ ایک شخص کو حکومت کی طرف سے خط لے کر تم کو فلاں جگہ جلاتے ہیں فارسٹ افسر بنایا گیا ہے، تم وہاں جا کر اپنی ڈیوٹی سنبھالو۔ تو اس کے ذہن میں فوراً چند سوالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس وقت وہ سرکاری ملازمتوں کے متعلق حکومت کے شانہ شدہ قواعد و ضوابط سے رجوع کرے تو وہ دیکھے گا کہ وہاں اس کے سارے سوالات کا پیشگی جواب لکھ دیا گیا ہے۔ ”گھر سے ڈیوٹی کے مقام تک جانے کی صورت کیا ہوگی؟“ جواب یہ کہ تم کو پوری مسافت کے لئے معقول سفر خرچ دیا جاتا ہے۔ ”میں وہاں جا کر کس جگہ رہوں گا؟“ اس کا جواب یہ ہوگا کہ وہاں تمہارے رہنے کے لئے سرکاری ہوٹل بنا ہوا ہے۔ ”جنگل میں اپنی حفاظت کے لئے میں کیا کروں گا؟“ حفاظتی دستہ تمہارے ساتھ موجود رہے گا۔ ”گھر کے اخراجات کے لئے کیا ہوگا؟“ تم کو ماہانہ تنخواہ کے طور پر ایک معقول رقم دی جائے گی۔ اسی طرح ملازم کے ہر سوال کا ایک اطمینان بخش جواب حکومت کے پاس موجود ہوگا۔ ہر تفرقہ راز مایا جہتاً ہے کہ جس کو مقرر کیا جائے، اس کی ضروریات اور مشکلات کا بھی اس میں پورا لحاظ رکھا گیا ہو۔

اسی طرح خدا نے جب آپ کو ایک کام پر مقرر کیا ہے تو اسی کے ساتھ اس نے یقینی طور پر آپ کی ہر ضرورت کا انتظام بھی کر دیا ہے۔ خدا تمام مہربانوں سے بڑھ کر مہربان ہے۔ اس کے ہاتھ میں زمین و آسمان کا اقتدار ہے۔ ذرا لے دو سائل کا

سارا خزانہ اس کی مٹھی میں ہے۔ ناممکن ہے کہ وہ اپنے عاجز اور حقیر بندوں کو ایک کام پر مقرر کرے اور پھر ان کی ضروریات کا لحاظ نہ کرے۔ یہ اس کی صفت رحیمیت کے خلاف ہے۔ یہ اس کی شان اقدار کے منافی ہے۔ بلاشبہ اس نے خادمانِ دین کی تمام ضروریات کا اس دنیا میں مکمل انتظام کر دیا ہے۔ ایسا انتظام کہ آخرت میں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ دین کی خدمت کرنا چاہتا تھا مگر دشواریوں اور مشکلوں کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکا۔

یہ انتظام کیا ہے اور ہم کس طرح اسے جائیں، اس کی میں نہایت آسان صورت آپ کو بتاؤں۔ آپ خدمتِ دین کے کام کا ارادہ کیجئے اور اس کے بعد سوچئے کہ اس کام میں آپ کی کیا کیا ضرورتیں ہو سکتی ہیں۔ جتنی معقول ضرورتیں اور واقعی مسائل آپ کی سمجھ میں آئیں، ان سب کی ایک فہرست بنا ڈالئے اور اس کے بعد خدا کی کتاب کھول کر اس کو ابتدا سے پڑھتے شروع کیجئے۔ باطل اسی طرح جیسے ایک ملازم سرکار اپنی ملازمت کے مسائل کے متعلق جاننے کے لئے حکومت کے قواعد و ضوابط کا مطالعہ کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب آپ ایسا کریں گے تو آپ کو نظر آئے گا کہ خدا کی کتاب آپ کے ہر معقول مطالبے کا قطعی اور یقینی جواب دیتی چلی جا رہی ہے۔ کسی بھی ایسا حقیقی ضرورت کا آپ تصور نہیں کر سکتے جس کا خدا کی کتاب ذمہ نہ لے رہی ہو۔ اس معاملہ میں ہرگز آپ کتاب الہی کو خاموش نہ پائیں گے۔ اس کے بعد مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ خدا کی کتاب میں ہماری کسی ضرورت کے بارے میں ایک یقین دہانی کا لانا اس بات کی کافی ضمانت ہے کہ ہم اس پر بھروسہ کریں۔ ایمان کا مطلب خدا پر توکل ہے اور ایمان کے لفظی معنی بھروسہ اور اعتبار ہی کے آتے ہیں (دیسف ۱۱) خدا پر اور قرآن پر ایمان لانے کا اصل مطلب یہی ہے۔ اس لئے اگر ہم خدا کی کتاب میں ایک یقین دہانی پالینے کے باوجود اس پر اعتماد نہ کریں تو یہ خود ہمارے ایمان کے خلاف ہو گا۔ ایسی صورت میں ہم کو خود اپنے ایمان پر نظر ثانی کرنی چاہئے کہ ہم قرآن کے الفاظ پر مشتبہ کریں۔

۱۔ آئیے ہم اس حیثیت سے قرآن کا ایک مختصر مطالعہ کریں۔ موجودہ زمانے میں دین کی خدمت کرنے کا ارادہ ہم سے کس ضرورتوں کا تقاضا کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایک دائی کے سامنے سب سے پہلا سوال جو آتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ پُر امن عمل کام ہے اور میں نہایت کمزور ہوں۔ خاص طور پر اس کے لئے زبان و قلم کی زبردست طاقت درکار ہے اور مجھے اس پر قدرت نہیں۔ اس کا آغاز زبان و قلم ہی سے ہوتا ہے۔ اس لئے اس اعتبار سے اپنی بے مائی کا احساس اور حالات کی ناسمجھت کی وجہ سے بہت جتنی۔ یہ دو چیزیں سب سے پہلے موجودہ زمانے میں دعوتی کام کی بات سوچنے والے پر طاری ہوتی ہیں۔

یہ مسئلہ دین میں رکھ کر جب ہم قرآن کے صفحات پر نظر ڈالتے ہیں تو بنی اسرائیل کی تاریخ کا ایک واقعہ ہمارے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ بنی اسرائیل کے ایک مرد صالح کو اللہ تعالیٰ کو وہ طور پر بلا کر اس کو پیغمبری عطا کرتا ہے اور اس کو یہ خدمت سونپنا ہے کہ وہ فرعون اور مصر کی قبطی قوم کے پاس جا کر اس کو خدا کا پیغام پہنچائے۔ حضرت موسیٰ حکوم فرمے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کو ملک کی حکمران قوم کو خطاب کرنے کا کام سونپا جا رہا تھا۔ اس تقریر کو سن کر وہ بے اختیار کہ اٹھے کہ خدایا میں اپنے اندر اس کی ہمت نہیں پا رہا ہوں اور میری زبان میرا ساتھ دیتی ہوئی نظر نہیں آتی:

رَبِّ إِنِّي أَخَافُ أَنْ يُكَلِّمَ بَدُونِ كَيْفَ يُصِيبُ صَدْرِي وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِي شِعْرًا ۱۲-۱۳  
 خدایا مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھے جھٹلا دیں گے میرا سینہ تنگ ہو رہا ہے اور میری زبان نہیں چلتی۔

خدا کی طرف سے جواب ملتا ہے کہ تم ڈر دو مت۔ تمہاری ضرورت کی سب چیزیں تم کو ہماری طرف سے دے دی گئیں۔  
 قَدْ اُوْتِيتَ سُوْاْلَكَ يَا مُوسٰى (طہ - ۳۶)

یہ مانگنے اور دے جانے کا واقعہ جو قرآن میں نقل کیا گیا ہے، وہ بنی اسرائیل کی تاریخ کے ایک واقعہ کی شکل میں ہماری اسی قسم کی مانگ کا جواب ہے۔ امت محمدیہ کے افراد جو ختم نبوت کے بعد نبوت کے کام پر مامور کئے گئے ہیں ان کے لئے بنی اسرائیل کے پیغمبر کا یہ واقعہ ایک پیشگی بشارت ہے۔ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ اگر تم ہمارے دین کی دعوت دینے کے لئے اٹھو تو ہم تم کو زبان دیں گے جس سے تم بولو گے، اور ہم تمہاری ڈھارس بندھائیں گے۔ جس کے بعد تم بڑے بڑے مواقع پر کسی چٹکی ہاٹ کے بغیر ہماری آواز پہنچا سکو گے۔ مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اگر آج کسی بندہ خدا کے اندر حقیقتہً دہائی بننے کا جذبہ ابھرائے اور وہ بے تابانہ اپنے رب کو پکار اٹھے کہ میں یہ کام کرنا چاہتا ہوں مگر:

اللہم بیضق صدی ولا یطلق لسانی  
 خدایا میرا سینہ تنگ ہو رہا ہے اور میری زبان چلی نہیں  
 تو یقیناً کلامِ الہی اس کو دوبارہ آواز دے کر کہے گا کہ جاؤ ہم نے تم کو وہ چیز دے دی جس کی تمہیں ضرورت تھی۔ وہی خدا آج بھی اس دنیا کا خدا ہے جس نے کوہ طور پر حضرت موسیٰ کو خطاب کیا تھا۔ وہ آج بھی وہی کچھ کر سکتا ہے جو اس نے ہزاروں برس پہلے اپنے ایک بندے کے ساتھ کیا تھا۔ وہ چاہے تو گونگے کو ناطق بنا دے اور بولنے والے شخص کو گونگا کر دے۔ کم زور دل کو بہت دے دے اور بہت دالے کو پست کر کے بٹھا دے۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ پھر ہم کیوں نہ اس کے اوپر بھروسہ کریں۔

۲۔ دوسری ضرورت جس کا اس سلسلے میں سوال پیدا ہوتا ہے، وہ معاش کا مسئلہ ہے۔ آدمی جب دین کی ضرورت پوری کرنے کے لئے اٹھتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی اپنی ضروریات تو ختم نہیں ہو جاتیں۔ اس کے جہانی تقاضے، اس کا گھر، اس کا خاندان، اس سے بہت سی چیزیں مانگتے ہیں۔ اگر وہ دین کے کام کی طرف جھکے تو ذاتی کاموں میں کمی ہوتی ہے اور ذاتی ضروریات میں اپنی توجہ صرف کرے تو دین کا خانہ خالی رہ جاتا ہے۔ یہ دوسرا سوال ہے جو ہر دہائی کے سامنے لازماً پیش آتا ہے اور اس کو پریشان کرتا ہے۔

یہ سوال لے کر ہم قرآن پڑھنا شروع کرتے ہیں تو بہت سے مقامات ہم کو ملتے ہیں جہاں اس معاملہ میں ہم کو خدا کی مدد کا یقین دلایا گیا ہے۔ یہاں تک کہ ہم قرآن کی ۶۵ ویں سورہ میں پہنچ جاتے ہیں اور وہاں یہ الفاظ لکھے ہوئے پاتے ہیں:

وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا يُرِيهِ مِنْ رِزْقِهِ  
 جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا تو اللہ اس کے لئے کشادگی پیدا کر دے گا اور اس کو ایسی ایسی جگہوں سے رزق پہنچائے گا جہاں  
 حیث لا یحسب  
 (طلاق ۲) اس کا گمان بھی نہیں جاسکتا۔

یہ ایک بہت بڑی یقین دہانی ہے، یہ ایک عظیم انشورنس ہے جو خدا کی طرف سے اہل ایمان کو دیا گیا ہے۔ آج کا انسان سمجھتا ہے کہ صرف اس کا گھیت، اس کی دکان اور اس کی ملازمت واحد ذریعے ہیں جو کسی کو رزق دیتے ہیں۔ اس کو خدا کے عظیم تریشے کی سر سے خبری نہیں۔ اس کو معلوم ہی نہیں کہ یہاں ایک اور خزانہ ہے جو تمام معلوم خزانوں سے زیادہ بھرا ہوا ہے۔ یہاں ایک

اور دینے والا ہے جو تمام دینے والوں سے زیادہ دے سکتا ہے۔ اس لئے یہ لوگ خدا کے خزانے کو چھوڑ کر بس ادنیٰ خزانوں کے سامنے دامن پھیلائے کھڑے ہیں۔ وہ چھوٹے ذریعہ کو پا کر خوش ہیں۔ حالانکہ وہ اس سے بڑا ذریعہ بھی حاصل کر سکتے تھے۔ موجودہ انسان کی مثال اس بے صبرے نوجوان کی کسی ہے جس کو گھر پر باپ کی وراثت میں مقبول زمین ملی ہو۔ مگر دیہات کے خشک ماحول سے گھبرا کر وہ بھی بھاگ جائے اور وہاں واشنگ فیکٹری میں کلر کی حاصل کر کے سمجھے کہ میں نے اپنے رزق کا ذریعہ حاصل کر لیا۔ حالانکہ کبھی کی اس ملازمت زندگی میں وہ جو کچھ حاصل کر رہا ہے، اس سے بہت زیادہ خود اپنے گھر پر وہ اپنے کھیتوں اور باغوں میں کام کر کے آنا داناہ طور پر حاصل کر سکتا تھا۔

۳۔ اب تیسری ضرورت کا تصور کیجئے جو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب داعی مشکلات میں پھنس گیا ہو۔ جب حالات سے اس کا ٹکراؤ شروع ہو گیا ہو، جب باطل طاقتیں اس کو کھینچنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوتی ہوں۔ یہ ہمارے اہتیلہ کا نازک وقت ہوتا ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب دائمی کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔

اس صورت حال کا احساس لے کر جب ہم قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بار بار نازک اوقات میں اہل ایمان کی مدد کی ہے۔ بلکہ ایسے وقت میں مدد کے لئے بھیجا، اس نے اپنے اوپر اہل ایمان کا حق قرار دیا ہے۔

كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ روم ۴۷  
اہل ایمان کی مدد کرنا ہمارے اوپر اہل ایمان کا حق ہے

بندے کے لئے اہتیلہ کا انتہائی وقت، آقا کے لئے بھی اس کی طرف متوجہ ہونے کا انتہائی وقت ہوتا ہے سچے کھانک اوقات میں وہ یہاں تک کرتا ہے کہ اپنی مخصوص فرج کو اہل ایمان کی کمک کے لئے روانہ کر دیتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

إِذْ تَسْتَعِينُونَ رَبَّنَا مَا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا  
یٰٓأَيُّهَا مَنِ الْمَلَائِكَةُ مُرْسِلِينَ (انفال- ۹) ہزار فرشتے بھیج کر تمہاری مدد کروں گا

یہ ممکن نہیں ہے کہ خدا کے خادم حقیقی خادم پر خدا کے دشمن حملہ آور ہوں۔ انھوں نے اس کا زفرہ کر لیا ہو، اور خدا بس دور سے اس کا تمنا دیکھتا ہے، یہ بالکل ناقابل تصور ہے۔ ایسے مواقع پر تو خدا کی غیرت و رحمت دوسرے مواقع کے مقابلے میں اور زیادہ شدت کے ساتھ بھڑک اٹھتی ہے۔ مگر مدد کا یہ معاملہ صرف ایسے ہی لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو حقیقی خادم اور سچے وفادار ہوں۔ اکتوبر ۱۹۶۲ء میں جب تیز یورپ میں عینی حملہ کا خطرہ بہت بڑھ گیا تھا حکومت ہند کا ایک اعلیٰ افسر وہاں سے ڈر کر قبل از وقت بھاگ گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے اس کو ملازمت سے برخواست کر دیا۔ اگر وہ جرأت اور وفاداری کے ساتھ اپنے مقام پر ڈھار ہتا، تو ہو سکتا تھا کہ خطرہ پیش آنے کی صورت میں حکومت کا خاص ہوائی جہاز بھیجا جاتا کہ وہاں جا کر افسر اور اس کے خاندان کو شہر سے نکال لائے۔

یہ چند مثالیں یہ سمجھنے کے لئے کافی ہیں کہ کس طرح خدا نے اپنے دین کے نادموں کی تمام ضروریات و مسائل کا ذمہ لیا ہے۔ مگر یاد رکھئے قرآن میں ہماری ضرورتوں کے بارے میں یہ جو یقین دہانیاں کی گئی ہیں اس کا مطلب لازمی طور پر یہ نہیں ہے کہ خدا کے فرشتے ہر صبح و شام آسمان سے خوان لے کر آئیں گے اور ہمارے سامنے بچھا دیا کریں گے۔ اگرچہ ایسا بھی ہو سکتا ہے مگر عام حالات میں اللہ تعالیٰ کی سنت یہ نہیں ہے۔ ہماری اہتیلہ جات کی تکمیل کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی مدد کا مطلب

در اصل یہ ہے کہ وہ حالات کو اس طرح ہمارے موافق بنا دے گا کہ ہم باسانی اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔ وہ ایسے امکانات پیدا کرے گا جن کو استعمال کر کے ہم اپنی کار بر آری کر سکتے ہوں، وہ لوگوں کے دلوں میں ہمارے متعلق ایسے خیالات ڈالے گا کہ وہ ہمارے کام آسکیں، وہ ہمارے ذہن کو ایسی تدبیروں کی طرف لے جائے گا، جس کے بعد مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔ وہ امکان کی برکت سے ذہنی اور نفسیاتی صلاحیتوں کو ایسی جلا دے گا کہ صلاحیت والے بہتر صلاحیت والوں سے زیادہ کام کر سکیں گے، مقابلے کے وقت وہ ہمارے دلی کو مضبوط کرے گا اور دشمن کو مرعوب کر کے شکست کو آسان بنا دے گا۔ مختصر یہ کہ ہمارے کام بھی انھیں ظاہری حالات کے اندر ہوں گے جیسے سب کے جوتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایمان کی برکت اور اللہ تعالیٰ کی توجیہ کی بنا پر حالات میں کچھ ایسا غیر معمولی پن آجائے گا کہ کتر وسائل سے ہم زیادہ کام لے سکیں گے اور معمولی ساز و سامان کے باوجود زیادہ نتائج حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

دوستو! یہ باتیں جو میں نے آپ کے سامنے عرض کی ہیں، یہ کوئی جذباتی نعرہ نہیں ہے اور نہ شعاعی ہے۔ یہ ایک سربلہ حقیقت کا اظہار ہے۔ انہماں دنیا میں کوئی چیز ممکن ہے تو سب سے بڑا ممکن یہ ہے کہ بندہ جب خدا کی مدد کا محتاج ہو تو خدا اس کی مدد کرے۔ اس زمین و آسمان میں ہر دوسرے امکان کے بارے میں مجھے شبہ ہو سکتا ہے۔ مگر یہ امکان میرے لئے ہر شبہ اور تردد سے بالاتر ہے کہ خدا اپنے ان بندوں کی مدد کرتا ہے جو اس کے دین کی مدد کے لئے اٹھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ بندے کے اندر کوئی ذاتی طاقت ہے۔ بعض مذاہب کی طرح میں اس نظر سے پرکونی عقیدہ نہیں رکھتا کہ انسان اپنی ریاضت سے خدا کو یا فطرت کی برتر طاقتوں کو مسخر کر لیتا ہے۔ میرے نزدیک یہ بالکل لغو بات ہے۔ خدا کی مدد کو میں سب سے زیادہ قطعی اس لئے قرار دے رہا ہوں کہ یہ خدا کی اپنی صفت ہے۔ خدا کا رحیم اور قادر ہونا، اس کا خالق اور مالک ہونا لازمی طور پر تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنے عاجز اور محتاج بندوں کی مدد کرے۔ یاد رکھئے کہ یہ خدا کی شانِ خدائی کے باطل خلاف ہے کہ وہ بندوں کو عاجز و مجبور کی حیثیت سے پیدا کرے۔ اور جب بندوں کا بجز کسی ضرورت کا محتاج ہو تو وہ ان کی مدد نہ فرمائے۔ یہ خدا کی شان کے خلاف ہے۔ اس لئے یہ قطعاً ناممکن ہے۔

دوستو! اگر آپ کے پاس سننے کے لئے کان ہوں تو خدا کی کتاب پیکار رہی ہے۔ من انصادی ربی اللہ (دکن ہے جو خدا کے کام میں اس کا مددگار ہے) اور اسی کے ساتھ اس میں یہ ضمانت بھی موجود ہے کہ — ان تصدق اللہ ینصر کم (اگر تم خدا کی مدد کے لئے اٹھو گے تو خدا تمہاری مدد کرے گا) خدا آپ کو ایسے کام کے لئے پیکار ہا ہے جس میں وہ خود آپ کا مددگار ہے۔ دین کی خدمت خدا کی محبت کا راستہ ہے۔ اس کی مدد سے ہم نکر جو نہ کا راستہ ہے۔ یہ وہ راستہ ہے جو آپ کو جنت کی طرف لے جاتا ہے، اگر ایک ایسے کام کے لئے بھی آپ نہیں اٹھیں گے تو درس کام کے لئے اٹھیں گے۔ اور اس خدمت کے بغیر مر گئے تو خدا کا سامنا کس طرح کریں گے۔

اٹھئے کہ اس سے بڑا کوئی کام نہیں، اٹھئے کہ اس سے بڑی کوئی سعادت نہیں جو بھگتی رافرقان ربیع الثانی (۱۳۸۴ھ)

جماعت اسلامی ضلع اعظم گڑھ کے اجتماع میں کی گئی ایک تقریر؛ ادا ۱۹۶۳

## ہمیں کیا کرنا ہے

”ہمیں کیا کرنا ہے“ — اس سوال کا جواب ایک لفظ میں یہ ہے کہ میں اپنے آپ کو اور دوسرے بندگانِ خدا کو آگ کے عذاب سے بچانا ہے۔ قرآن نے زندگی کا جو تصور دیا ہے اس کے مطابق زندگی کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ آدمی آخرت میں خدا کی گرفت سے بچ سکے۔ اس آنے والے دن کی سختیوں سے اپنے آپ کو بچانا اور دوسرے انسانوں کو اس سے بچنے کی تلقین کرنا — یہی مسلمان کا اصل کام ہے اور اس کے سارے اعمال کا مرکز و محور یہی ایک چیز ہے۔

ہمارے ملک میں جو سب سے بڑا حادثہ پیش آ رہا ہے وہ یہ کہ یہاں بسنے والے انسانوں میں سے ہر روز نقصاناً ڈیڑھ لاکھ آدمی مرتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ موت کے فرشتے کل کے لئے جن ڈیڑھ لاکھ آدمیوں کی فہرست تیار کر رہے ہیں اس میں ہمارے ملک کے باشندوں میں سے کس کس کا نام ہو۔ ہم میں سے ہر شخص کو موت آتی ہے، مگر ہم میں سے کوئی شخص نہیں جانتا کہ اس کی موت کب آئے گی اور جن لوگوں کے درمیان ہم زندگی گزار رہے ہیں ان کے مستقبل بھی کچھ نہیں معلوم کہ ان میں سے کون کل اٹھایا جائے گا اور کون کل کے بعد ہمارا پیغام سننے کے لئے باقی رہے گا۔

ایک طرف یہ حقیقت ہے اور دوسری طرف یہ واقعہ کہ موت ہماری زندگی کا خاتمہ نہیں بلکہ ہماری اصل زندگی کا آغاز ہے۔ موت دراصل کسی انسان کا وہ وقت ہے جب وہ کائنات کی عدالت میں آخری فیصلے کے لئے پیش کر دیا جاتا ہے۔ اب اگر آپ ان دونوں چیزوں کو ملا دیں، یعنی زندگی کی بے اعتباری اور یہ کہ زندگی کا اصل مسئلہ کیا ہے، تو فوراً آپ کی سمجھ میں آجائے گا کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ موت سے پہلے آدمی کو بہت سے کام نظر آتے ہیں۔ مگر موت کے بعد آدمی کے سامنے ایک ہی کام ہوگا۔ وہ یہ کہ خدا کے غضب سے دس طرح بچے۔ جب آدمی کے پاس بہت زیادہ وقت ہو تو وہ بہت سے کام پھیر دیتا ہے مگر جس کو وقت کے صرف چند لمحے حاصل ہوں وہ صرف وہی کام کرتا ہے جو انتہائی ضروری ہے فیصلہ کن لحاظ میں کوئی شخص غیر متعلق کام میں مصروف ہونے کی حماقت نہیں کر سکتا۔

یہ آنے والا وقت ہم میں سے ہر شخص کی طرف دوڑا چلا آ رہا ہے۔ ہر زندہ انسان اس خطرے میں مبتلا ہے کہ کل اس کی موت آجائے اور اس کے بعد نہ اس کے لئے سسنے کا موقع باقی رہے اور نہ ہمارے لئے سنانے کا۔ یہ صورت حال خود بتا رہی ہے کہ آپ کے کرنے کا کام کیا ہے۔ آپ کے کرنے کا کام یہ ہے کہ آپ اس ملک کے ایک ایک شخص تک پہنچیں اور اس کو زندگی کے حقیقی مسئلہ سے آگاہ کریں۔ اس ملک کی آبادی اگر ساٹھ کروڑ ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کو ساٹھ کروڑ کام کرنے ہیں۔ کیوں کہ آج کا ہر انسان حقیقت سے غافل ہے۔ ہر آدمی اس بات کا حاجت مند ہے کہ اس کو حقیقت کا علم پہنچایا جائے۔

ہمارے رہنما حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جب دعوتِ حق کے کام پر مامور کیا گیا تو آپ نے مکہ میں ایک تقریر کی۔ نبی کی حیثیت سے یہ آپ کی پہلی تقریر تھی۔ حمد و ثنا کے بعد آپ نے فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ اُرِيْتُ كَيْفَ يَهْدِي الْغُلَامَ وَهُوَ فِي بَطْنِ امِّهِ لَمْ يَسْأَلْهُ وَاللَّهِ لَوْ كُنَّ بَنَاتٍ لَّانْتَفَسْنَ  
بِحَمِيصٍ مَا كُنَّ بَنَاتٍ وَكُوْنُ غُرُومٍ النَّاسُ جَمِيْعًا مَا

تمام لوگوں سے جوڑ کر کہہ سکتا جب بھی تم سے جوڑ نہ کہتا۔ اور

اگر میں تمام لوگوں کو دھوکا دے سکتا جب بھی تمہیں دھوکا نہ دیتا۔ اس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی خدا نہیں، میں خدا کی طرف سے بھیجا ہوا رسول ہوں تمہاری طرف خاص طور پر اور دوسرے انسانوں کی طرف عام طور پر۔ خدا کی قسم تمہیں مزنا ہے جس طرح تم سوتے ہو اور پھر تمہیں اٹھنا ہے جس طرح تم جاگتے ہو۔ اور یقیناً تم سے تمہارے اعمال کا حساب لیا جائے گا۔ پھر اچھے عمل کا اچھا بدلہ ملے گا اور برے عمل کا برا بدلہ۔ اس کے بعد یا تو ہمیشہ کے لئے جنت ہے، یا ہمیشہ کے لئے آگ۔

عَدْرَتِكُمْ وَاللَّهِ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ إِنْ لَمْ يُسْأَلِ اللَّهُ  
إِنَّكُمْ خَاصَّةً وَالنَّاسِ كَاقْتِدَارِ اللَّهِ لِمُؤْمِنَاتٍ مَّن  
بَيْنَهُنَّ وَتَتَّبِعْنَ مَا كُنَّ تَقْتَضُونَ وَلَمَّا صَبُرْنَ بِنِسَاءِ  
تَعْمَلُونَ وَكُلَّحَرْزٍ ذُنُوبًا بِإِحْسَانٍ أَحْسَانًا وَبِالسُّورَةِ  
مُؤْتَاةً وَإِنَّمَا كُنَّ مَأْتِبَاءً أُولَئِكَ أَبْدَاءُ  
(حجرتہ خطب العرب، حصہ اول، صفحہ ۵۱)

ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: اَنَا الَّذِي يُزِيلُ الْعَرْشَ يَأْتِ (متفق علیہ) یعنی میرا کام تم کو آخرت کے عذاب سے ڈرانا ہے جس طرح "نذیر عریاں" اپنے قبیلے کو آنے والے خطرے سے ہوشیار کرتا ہے۔ اسی لئے نبی کو قرآن میں "نذیر و بشیر" کہا گیا ہے، یعنی وہ مستقبل کے خطرے سے لوگوں کو آگاہ کرتا ہے اور جو لوگ اس کے مطابق اپنے کو بنا لیں ان کو اس بات کی خوشخبری دیتا ہے کہ وہ کامیاب ہوں گے۔ اور اسی لئے امت مسلمہ کا مقصد "شہادتِ حق" بتایا گیا ہے۔ یعنی لوگوں کے سامنے اس بات کو واضح کرنا کہ حق کیا ہے اور خدا کے یہاں ان کی نجات کا دار و مدار کس چیز پر ہے۔ یہ خدا کی طرف بلانا اور آنے والے دن سے ہوشیار کرنے کے لئے نذیر عریاں بن جانا وہ سب سے بڑا انقلابی پروگرام ہے جس سے اب تک انسان واقف ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے بڑے کسی عملی پروگرام کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرے پروگرام جو دنیا میں اختیار کئے جاتے ہیں وہ اپنے الفاظ اور فرول کے لحاظ سے بہت بڑے بڑے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ سب کے سب نہایت حقیر اور محدود ہیں۔ ان کا دائرہ انسانی زندگی میں تھوڑی تھوڑی دور جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں یہ نظریہ انسان کے اندر آخری حد تک سرایت کرتا ہے، یہ فساد کبیر کے خلاف جہادِ عظیم ہے جو دائمی کو سر تا پا مہر دت بنا کر رکھ دیتا ہے۔ وہ اس کے تمام ظاہری و باطنی معاملات میں انقلاب برپا کرنے والا ہے۔ یہ کام اپنی ابتدا میں ایک کام ہے مگر جب وہ عمل میں آتا ہے تو شاخ در شاخ پھیلتا ہوا ہزار کام بن جاتا ہے۔

جو لوگ صرف اقتدار کے لئے اٹھتے ہیں ان کا کام اس وقت ختم ہو جاتا ہے جب وہ ایک حکمران خاندان کو تختل کر دیں یا چند سیاسی لیڈروں کو زیر کر کے ان سے حکومت کی کرسی چھین لیں۔ جب کہ یہ نظریہ ان تمام انسانوں کو فتح کرنا چاہتا ہے جو زمین کے اوپر چل پھر رہے ہیں۔ سماجی اصلاح کا پروگرام چند اسکول اور چند ہسپتال بنوانے کے بعد مطمئن ہو جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کا کام ہو گیا، جب کہ یہ نظریہ دلوں اور دماغوں کو بدل کرنے قسم کے انسان و بچہ میں لانا چاہتا ہے جس سے زیادہ مشکل کوئی کام اس سرزمین کے اوپر نہیں ہے۔ معاشی اسکیمیں چند سال کی ذمہ داری زندگی کے لئے کچھ نشانے آدمی کے سامنے رکھ دیتی ہیں۔ جب کہ یہ نظریہ لامتناہی زندگی کی بے حساب کامریاں حاصل کرنے

کے لئے آدمی کو متحرک کرتا ہے۔ ہر دوسرے کام کا ایک خاص میدان ہے۔ یہ میدان جہاں موجود نہ ہو وہاں اس کے کارکن بے دست و پا نظر آتے تھے ہیں مثلاً اشتراکیت ایسے ماحول میں اپنے آپ کو بے بس پاتی ہے جہاں مزدور اور سرمایہ دار کے درمیان جھگڑے نہ ہوں۔ آزادی کی تحریک کے لئے اس وقت کرنے کا کام کچھ نہیں رہتا جب یہ روٹی آفتا ہٹ گئے ہوں اور ان کی جگہ نئی آقاؤں نے لے لی ہو۔ مگر یہ نظریہ ایک ایسا وسیع اور ہمہ گیر نظریہ ہے جس کے لئے ہرقت کرنے کا کام ہے اور ہر جگہ اس کے لئے کام کا میدان موجود ہے۔

پھر اس نظریے کی خصوصیت بھی ہے کہ وہ سب سے پہلے خود داعی کو بدل دیتا ہے، جب کہ دوسرے نظریات کا حال یہ ہے کہ وہ صرف دوسروں سے تبدیلی کا مطالبہ کرتے ہیں، خود اپنے پیروؤں کے اندر تبدیلی لانے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ چنانچہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک تحریک کچھ انسانوں کو جمع کرتی ہے تاکہ وہ خدائی قلت کے خلاف حکومت سے احتجاج کریں۔ مگر یہ افراد بجلی کے کھبے توڑنا شروع کر دیتے ہیں، دکانوں کو لوٹتے ہیں، فٹے کے گوداموں میں آگ لگا دیتے ہیں، ریلوں اور سبوں کو چلنے سے روک دیتے ہیں۔ اس طرح ایک چیز کی قلت ددر کرنے کے لئے وہ بے شمار قلتیں ملک میں پیدا کر دیتے ہیں اور ساری زندگی کو تہس نہس کر کے رکھ دیتے ہیں۔ وہ دوسروں کی جس برائی کے خلاف احتجاج کرتے ہیں خود اسی میں اکت پت ہوئے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس ”آنے والے دن“ کی گواہی دینے کے لئے جو لوگ اٹھتے ہیں ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ کام کا آغاز خود اپنی ذات سے کرتے ہیں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں سب سے پہلے خود اس پر عمل کرتے ہیں۔ تمام اصلاحی اسکیمیں یہاں پہنچ کر ناکام ہو جاتی ہیں کہ اپنے پروگرام کے نفاذ کے لئے جن انسانوں سے انھیں کام لینا ہے وہ خلوص اور بے غرضی کے ساتھ ان کو ناکند کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام انقلابی اسکیمیں کسی نہ کسی مقام پر پہنچ کر اپنے مخالف سے سبھو تہ کر لیتی ہیں۔ بادشاہوں کے اقتدار کے خلاف اٹھنے والی تحریکیں سیاسی لیڈروں کے اقتدار پر آشوب ہوتی ہیں۔ نجی مالکوں کی سرمایہ داری سے بغاوت کرنے والے دولت اور زمین کو اشتراکی متولیوں کے حوالے کر کے خاموش ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ نظریہ وہ واحد نظریہ ہے جو انسان کے اندر حقیقی تبدیلی پیدا کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ وہ آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ اپنے عقیدہ کو عمل بنائے اور ساری زندگی اس پر عمل کرتا رہے۔

دوسرے نظریات عام طور پر صرف مفقید کا جذبہ ابھارتے ہیں، جب کہ ”آنے والے دن“ کا تصور عمل کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ دوسرے نظریوں میں، اس نظریہ پر ایمان لانے کے بعد آدمی مجبور ہوتا ہے کہ سب سے پہلے خود عمل کرے جب کہ دوسرے نظریات صرف دوسروں سے عمل کا تقاضا کرتے ہیں، ان کے اندر ایسا کوئی محرک نہیں ہوتا جو داعی کو خود عمل کرنے پر ابھارتا ہو۔ مگر جس شخص کو اس حقیقت نے متحرک کیا ہو کہ موجودہ زندگی امتحان کی زندگی ہے، ہم آزاد نہیں ہیں کہ جو چاہیں کرتے رہیں، بلکہ ہمارے تمام کھلے اور چھپے اعمال کا ایک روز حساب لیا جانے والا ہے۔ ایسا شخص عین اپنے ایمان کے تقاضے سے مجبور ہوتا ہے کہ اپنی پوری زندگی کو درست کرے۔ اپنے آپ کو آخری حد تک مقصد کی خدمت میں لگا دے۔ دوسروں کو بدلنے کی دعوت دینے کے ساتھ خود بھی اپنے آپ کو بدل ڈالے کیوں کہ اس کے بغیر وہ اپنی کامیابی کا تصور نہیں کر سکتا۔ صرف دوسروں کی تبدیلی اس کی نجات کا سبب نہیں بن سکتی۔ اس کی نجات تو اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ

وہ خود بھی اپنے آپ کو بیدل پکا ہو۔ دوسرے لفظوں میں یہ نظریہ — دعوت اور تربیت — دونوں کو ایک کر دیتا ہے۔ اس نظریہ کا آدمی جب دوسروں کو بیکار کرتا ہے تو وہ خود اپنے آپ کو مخاطب کر رہا ہوتا ہے اور جب وہ اپنے آپ کو مخاطب بناتا ہے تو اسی وقت اس کا تعلق دوسروں سے ہو جاتا ہے۔

اس نظریہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے کارکن کو بھی جو دین مبتلا نہیں کرتا اور نہ اسے مایوس ہونے دیتا۔ جو شخص اس مقصد کے لئے اٹھتا ہے اس کے سامنے بنیادی طور پر جو چیز ہوتی ہے وہ آخرت ہے۔ وہ اس لئے عمل کرتا ہے تاکہ اپنی بعد کی زندگی کو بہتر بنائے، تاکہ آخرت میں خدا کی گرفت سے بچ سکے۔ یہ چیز اس کو نفع نقصان اور کامیابی دنا کا می کے ذریعہ تصور سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ وہ نیچے کی طرف سے بے پردا ہو کر اپنا کام صرف یہ سمجھتا ہے کہ کوشش کرتا رہے اور اسی کوشش میں اپنی جان دے دے۔ اس کی انتہائی تمنا صرف یہ ہوتی ہے کہ فرشتے جب اس کی رپورٹ لے کر خدا کے پاس جائیں تو اس سے عرض کریں کہ خدا یا تیرا بندہ تیرے حکم کی تعمیل میں سرگرم ہے۔ ایک شخص کو بی۔ اے کرنے کے بعد روزگار نہ ملے تو وہ خود کشتی کر لیتا ہے کیونکہ اس کے نزدیک صرف تعلیم حاصل کرنا کامیابی نہیں ہے بلکہ تعلیم کے ذریعہ فواید کو حاصل کرنے کا نام کامیابی ہے۔ ایک سیاسی لیڈر کو اپنے مشن میں کامیابی نہ ہو تو وہ سیاست کا کام چھوڑ کر گوشہ نشین ہو جاتا ہے اور اپنی ناگامی کے احساس کو مختلف قسم کے مشغلوں میں چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک نوجوان دنیا کے مسائل کو دیکھتا ہے، اس کے اندر جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ ان کو حل کرے، اس جذبے کے تحت وہ دنیا کی ترقی کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ مگر چند سال بعد جب خود اپنی زندگی کے مسائل اسے گھیرتے ہیں اور اس سے اپنی تامل کا مطالبہ کرتے ہیں تو مسائل عالم کی اصلاح کا پروگرام اسے قبول جاتا ہے اور وہ اپنا گھر بنانے اور اپنے ذاتی مسائل کو حل کرنے میں لگ جاتا ہے۔ مگر جو شخص اللہ کے بندوں کو خدا کی طرف بلانے کے لئے اٹھا ہوا اس کے لئے ٹھہرنے اور مایوس ہونے کا کوئی سوال نہیں۔ کیونکہ اس کا راستہ دنیا میں کہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ وہ سیدھا آخرت تک جاتا ہے۔ وہ پہلے دن سے جانتا ہے کہ اس نے جس منزل کی طرف اپنا سفر شروع کیا ہے وہ اس وقت آتی ہے جب زندگی کی گاڑی اپنے آخری اسٹیشن پر پہنچ جائے۔ وہ آخر وقت تک لوگوں کو صراطِ مستقیم کی طرف پیکار تارہتا ہے یہاں تک کہ اسی حال میں اپنے رب سے جانتا ہے۔ مومن کے نزدیک کامیابی یہ ہے کہ وہ دنیا میں اپنے رب کی رضا کے لئے کام کرتا رہے، جب کہ دوسروں کے نزدیک کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنی کوشش کے نتیجے کو پالیں۔

حاشیہ: نئے سفر میں قافلہ باز منزل کرتے ہوئے چلتے ہیں جتنا فائدہ سفر میں ہی ہوشیار اور قابل اہتمام آدمی کو تیز رفتار سواری کے ذریعہ پہنچایا جاتا ہے تاکہ وہ محظوم کر کے آئے کہ اگلی منزلوں میں قافلہ کو ٹھہرانے کی فوجدان جگہ کن سی ہو سکتی ہے جو شخص اس کام کے لئے بھیجا جاتا ہے اسکو رازدہ کہتے ہیں۔ نئے عرب کی قبائلی زندگی میں جب کوئی شخص دیکھتا کہ دشمن اس کی قوم کے سربراہ کیلئے اور اس کو ڈرہ تو تاکہ اب وہ جگہ کرے گا تو وہ اپنے پیڑھے پھاڑ دیتا اور ننگا ہو کر چلنا شروع کرتا کہ ”دشمن آگے دشمن آگے“ ایسے شخص کو ”تذیر عریاں“ کہا جاتا تھا۔ یعنی ننگا ہو کر ہوشیار کرنے والا۔

نوٹ: یہ تحریر ماہنامہ زندگی رام پور (شوال، ذی قعدہ ۱۳۷۹) میں ادارہ کے طور پر شائع ہوئی۔

مصنف کی تحریریں مسلسل پڑھنے کے لئے

ماہنامہ الرسالہ کا مطالعہ کیجئے

اسلام کی فطری دعوت اور اس کے ابدی  
پیغام کو جدید اسلوب میں سمجھنے کے لئے  
الرسالہ اپنی نوعیت کا واحد جریدہ ہے

سالانہ زرقادون ۴۸ روپے

الرسالہ

سی - ۲۹ ، نظام الدین ویسٹ ، نئی دہلی ۱۱۳

## مصنف کی دوسری تصنیفات

امکانات جدیدہ للدعوة  
الشریعة الاسلامیة وتحديات العصر  
المسلمون بين الماضي والحاضر والمستقبل  
نحو بعث اسلامي  
وجوب تطبيق الشريعة الاسلامیة  
العلم على خطى الدين  
لابد من الثورة الفكریة  
قبل الثورة التشريعیة  
القرآن في مواجهة التحديات العصرية

ہندی مطبوعات  
انسان اپنے آپ کو پہچان  
منزل کی اور  
نوٹیک کے پر ویش دوار پر  
سچائی کی کھوج

انگریزی مطبوعات

Muhammad:  
The Prophet of Revolution  
God Arises  
Man! Know Thyself  
Muhammad:  
The Ideal Character  
The Way to Find God  
The Teachings of Islam  
The Good Life  
The Garden of Paradise  
The Fire of Hell  
Tabligh Movement  
Islam in Harmony with  
Human Nature  
The Final Destination  
No End to Possibilities  
The Achievement of  
Islamic Revolution  
Religion and Science  
The Prophet and his  
Companions

اسلام پندرہویں صدی میں  
راہیں بند نہیں  
ایمان خاقت  
استقامت  
سبق آموز واقعات  
زلزلہ قیامت  
حقیقت کی تلاش  
پیغمبر اسلام  
آخری سفر  
تعارف اسلام  
تعلیمات اسلام  
اسلامی دعوت  
خدا اور انسان  
حل یہاں ہے  
سچا راستہ  
دین تعلیم  
حیات طیبہ  
بارجنت  
ناجہ بنم  
دین کی سیاسی تعبیر

عربی مطبوعات

الاسلام يتحدی  
الدين في مواجهة العلم  
حكمة الدين  
الاسلام والعصر الحديث  
مسئوليات الدعوة  
نحو تدوين جديد للعلوم الاسلامیة

اردو مطبوعات  
اشد اكبر  
تذکیر القرآن  
الاسلام  
عظمت قرآن  
مذہب اور ہدیہ جیلنج  
ظہور اسلام  
اجاز اسلام  
پیغمبر انقلاب  
سوشلزم اور اسلام  
صراط مستقیم  
اسلامی زندگی  
اسلام اور عصر حاضر  
رازیات  
حقیقت حج  
خاتون اسلام  
تعبیر کی غلطی  
تبلیغی تحریک  
دین کیسے ہے  
قرآن کا مطلوب انسان  
تجدید دین  
اسلام دین فطرت  
تعبیر ملت  
تاریخ کا سبق  
مذہب اور سائنس  
عقائیات اسلام  
فوائد کا مسئلہ  
انسان اپنے آپ کو پہچان